روزگارِ فقیر

(شاعرِ مشرق سے چند ملاقاتوں کی یادداشت)

از

فقیر سیّد وحید الدّین



ملنے کا پتہ

سیّد برادرز ۵، ۷ دی مال لاہور

پہلا ایڈیشن دو ہزار

قیمت فی جلد تین روپے

روزگارِ فقیر



فقیر سید وحید الدین

روزگارِ فقیر

(شاعرِ مشرق سے چند ملاقاتوں کی یادداشت)

○

از

فقیر سید وحید الدین

دفتر

فقیر سپننگ ملز لمیٹڈ

۳۶/۱ کیمبل سٹریٹ، کراچی (پاکستان)

سلسلہ اشاعت

نقشِ اول سنہ ۱۹۵۰ء دو ہزار

نقشِ ثانی سنہ ۱۹۶۳ء ایک ہزار

(غیر معمولی اضافہ کے ساتھ)

قیمت فی جلد

سات روپے ۵۰ پیسے

مطبوعہ

لائن آرٹ پریس، دی مال، لاہور

طابع و ناشر :- فقیر سید وحید الدین

اِنتساب

شاعرِ مشرقؒ کے نام

اگر کاوی درونم را خیالِ خویش را یابی
پریشاں جلوہ چوں ماہتاب اندر بیابانے
(اقبالؒ)

فقیر سید وحید الدین



اشاریہ

نقشِ اوّل

نقشِ ثانی

افتتاحیہ

۱۹۵۰ء میں "روزگارِ فقیر" کا نقشِ اوّل پیش کرتے ہوئے میں نے اپنے پیش لفظ میں عرض کیا تھا

"شاعرِ مشرق علامہ اقبال مرحوم سے بچپن میں مجھے ملاقات کا شرف نصیب ہوا۔ اور مرحوم کی وفات تک یہ سعادت مجھے حاصل رہی۔ جب سے ان متفرق ملاقاتوں کے تاثرات میں ایک امانت کی طرح اپنے دل میں لئے پھرتا ہوں:

میں نے یہ اوراق آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت اس لئے کی ہے کہ اوّل علامہ مرحوم سے ہر متعلقہ امر قوم کی ودیعت سمجھتا ہوں؛ اور دوم مجھے فخر ہے کہ میں بھی علامہ مرحوم کے معاصرین کی اس نسل سے تعلق رکھتا ہوں جس کے جیل کوئی یہ کہہ نہیں سکے گا۔ کہ میں نے مشرق کے سب سے بڑے شاعر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اور اُس کی پُر شکوہ آواز اپنے کانوں سے سُنی ہے:"

اپنی اس کوتاہ اندیشی پر اب ندامت ہوتی ہے کہ شاعرِ مشرق کی زندگی کے اہم گوشوں سے متعلق بعض واقعات کو اُس وقت سرسری سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ اگرچہ اس کا

فیصلہ قوم اور اصحابِ فکرورائے کی صوابدید پر منحصر تھا۔ اب ان شاہدات اور واقعات کا نقشِ ثانی میں اضافہ کیا ہے اور ساتھ ہی اپنے متعدد احباب، عزیزوں اور بزرگوں کے سینوں میں سالہا سال سے محفوظ اُن نادر واقعات اور ملفوظات سے اِن اوراق کی زینت بڑھائی ہے، جن کے متعلق میرا ہمیشہ یہ خیال رہا۔ کہ یہ حضرات قوم کے سرمایہ کو کسی مناسب طریقہ سے خود ہی قوم کو منتقل فرما دیں گے۔

اس کتاب کا بنیادی موضوع "اقبال بحیثیت شاعر" نہیں، "اقبال بحیثیت انسان" اور "اقبال بحیثیت عاشقِ رسولؐ" ہے۔

حُسن اتفاق ہے کہ مجھے اِس کتاب کا نام منتخب کرنے میں خاصی جستجو کرنا پڑتی اگر مرحوم کی وہ مشہور رباعی اس نام کا ماخذ نہ بن جاتی جس کا دوسرا شعر یہ ہے ؎

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دِگر دانائے راز آید کہ ناید!

اپنی اس سادہ دلی کا اعتراف ضروری ہے کہ عنفوانِ شباب میں والدِ مرحوم کی جانب سے کوئی بڑی جائداد یا ترکہ نہ ملنے کا احساس اکثر مضطرب کیا کرتا تھا۔ لیکن "روزگارِ فقیر" کی تدوین کے دوران اپنی اس خام خیالی کا اندازہ ہوا کہ اقبال ایسے مفکرِ قوم، عظیم انسان اور عاشقِ رسول کی رفاقت اور سالہا سال اُن کی محفلوں سے وابستگی کا سرمایہ اُس ترکہ سے کہیں زیادہ قیمتی، قابلِ فخر اور پائدار ہے جو چند اینٹوں کی عمارات، کچھ زرعی اراضی اور طلائی و نقرئی سکوں کی صُورت میں ملتا۔

اس کتاب کو پیش کرنے میں ایک اور رُوحانی مسرت یہ حاصل ہو رہی ہے، کہ

والد بزرگوار فقیر سیّد نجم الدین مرحوم کو اپنے عزیز دوست اقبال مرحوم سے جو والہانہ عشق تھا یہ کتاب اس عشق کو حیاتِ جاوید بخشنے میں معاون ثابت ہوگی، اور میں اس خوشگوار فرض کی ادائگی پر اُن کے سامنے سُرخرو ہو سکوں گا۔

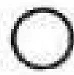
میں تمام احباب اور بزرگوں کے جذبہ خلوص کا معترف ہوں جنہوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی، عزیزی اقبال احمد صدیقی کا ذکر بھی ضروری ہے کہ میری مصروفیتوں کے دوران اس یادگار کتاب کی تدوین و اشاعت کے لئے شب و روز کاوش کی۔

"روزگارِ فقیر" میرا سرمایہ حیات ہے اور اس سرمایہ کو میں "دانائے راز" اقبال کے نام پر قوم کی خدمت میں فخر اور مسرت کے ساتھ پیش کرتا ہوں ؎

بیا بہ مجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

فقیر سیّد وحید الدین
"الفقیر"
ٹی۔ گلبرگ، لاہور

۲۷-جولائی ۱۹۶۳ء



تعارف

ہمارے روایتی اَدب میں تنقید نگاری تذکرہ نگاری ہی کا ایک جزو تصور کی جاتی تھی۔ ہمارا پرانا تنقیدی اَدب بیشتر تذکروں ہی سے عبارت ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارے پُرانے نقادوں نے کسی جامع اور واضح نظریہ کے ماتحت ادب اور زندگی کو اس طرح یکجا نہ کیا ہو لیکن کم از کم انھیں یہ شعور ضرور تھا کہ تخلیق کے ادراک کیلئے خالق سے شناسائی ضروری ہے اور خالق کو سمجھنے کے لئے اس کی دنیوی زندگی کے زمان و مکان کا تعین لازم۔ اس روایتی اسلوب میں خامیاں بھی تھیں۔ ایک ہی وقت میں تصنیف اور مصنف دونوں کی تصویر کھینچنے میں مصوّر کا قلم بسا اوقات لغزش کھا جاتا تھا اور تصویر کے دونوں رُخ اُدھورے رہ جاتے تھے لیکن تذکرہ نویسوں کی جملہ خامیوں کے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر ان کی فراہم کردہ واقعاتی معلومات ہمیں میسر نہ ہوتیں۔ تو ہمارے ادب کی تاریخ بہت حد تک تشنہ اور نامکمل رہ جاتی۔ ادب کی طرح تنقید کا ڈھنگ بھی وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ تنقید میں ادب برائے ادب کے نظریہ کا چرچا ہوا تو بعض نقاد تذکرہ نگاری کی اہمیت سے بھی انکار کرنے لگے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ہر ادبی تصنیف بجائے خود ایک جامع حقیقت ہے اس کی خوبیوں اور خرابیوں کا استخراج اسی تصنیف کے بطن سے کرنا چاہئے اور اسے سمجھنے یا پرکھنے کے لئے شاعر کا پیٹ چاک کرنا ضروری نہیں ہے۔ کوئی کتاب کب لکھی گئی۔ کس نے لکھی

کیوں لکھی، یہ سب لاتعلق باتیں ہیں۔ جن پر توجہ دینا تضیع اوقات ہے۔ ہر چند یہ جاذب لیکن سطحی نظریہ بھی اپنی طبعی موت مر چکا ہے۔ لیکن ادبی مطالعہ کے مروجہ اسالیب و طرائق میں اس کے اثرات بہت حد تک باقی ہیں۔ اس کا ایک بیّن ثبوت یہ ہے کہ ادبی محقق کسی تصنیف کے متن کی تصحیح و تفسیر، تشریح اور تفہیم میں اتنا سر کھپاتے ہیں کہ نہ مصنف کے دل و دماغ کا تجزیہ انھیں سُوجھتا ہے اور نہ اُن سماجی اور معاشرتی محرکات پر ان کی نظر پڑتی ہے جو ہر مصنف کی مخصوص ادبی شخصیت کی تخلیق کرتے ہیں۔ ہر اجنبی اصطلاح اور نامانوس ترکیب کی تحقیق و تفتیش کے لئے اسناد کی تلاش ہوتی ہے۔ لغت کی کتابوں کو کھنگالا جاتا ہے جملہ دستیاب نسخوں کا تطابق اور تقابل کیا جاتا ہے۔ لیکن عام طور سے کسی مصنف کی ذہنی اور قلبی واردات کے سرچشموں کی تحقیق اور دریافت میں اس کاوش سے کام نہیں لیا جاتا۔ چاہئے یہ کہ مصنف کی ذات کے اجنبی گوشوں اور اس کی شخصیت کی غیر معروف گہرائیوں کی تحقیق بھی اسی ڈھنگ سے کی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس تحقیق میں ان تمام سماجی اور اجتماعی مظاہر اور عوامل کا مطالعہ بھی شامل ہوگا۔ جو ہر انفرادی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۔

اس اعتبار سے "روزگارِ فقیر" محض ایک دلچسپ تصنیف ہی نہیں قابلِ قدر بھی ہے۔ غالباً اب یہ ثابت کرنے کی ضرورت باقی نہیں کہ علامہ اقبال مرحوم ہمارے دور کی سب سے اہم اور سب سے عظیم المرتبت ادبی شخصیت تھے لیکن یہ کہنا بھی غالباً غلط نہ ہوگا۔ کہ ہر چند مرحوم کے متعلق تنقیدی ادب کا ایک ذخیرہ جمع ہو چکا ہے۔ ان تصنیفات میں شاعرِ مشرق کی ذات شاذ ہی دکھائی دیتی ہے۔ بیشتر لکھنے والوں نے اپنا زورِ قلم اقبال کے فلسفیانہ عقاید اور تعلیمات کی تفسیر و تشریح پر صرف کیا ہے اور اقبال کے شعر میں بھی اقبال کی ذات

کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

"روزگارِ فقیر" حیاتِ اقبال کا جامع تذکرہ نہیں ہے۔ اس میں شاعرِ مشرق کی شخصیت یا اس شخصیت کے کسی پہلو کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کی نوعیت ایک سیّاح کی ڈائری کی سی ہے۔ جو کبھی کسی دلکش وادی میں سے گزرا ہو۔ اور کئی برس بعد فرصت کے اوقات میں اس حسین سفر کی بسری ہوئی یادوں کی شیرازہ بندی کرنا چاہے۔ کسی دلفریب صبح کی ایک جھلک کسی دلکش شام کا ایک منظر ہوا میں اُڑتا ہوا ایک خزاں رسیدہ پتّا یا جنگل میں سر جوڑے ہوئے ہزاروں نادر درخت گھاس پر جگمگاتا ہوا شبنم کا اکلوتا موتی یا شفق میں ڈوبی ہوئی کوئی وسیع اور ذخار جھیل چھوٹی اور بڑی باتیں۔ فطرت کے حقیر اور عظیم مناظر، واضح مبہم نیم مبہم یادیں جو بھی سیّاح کے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس نے بلا کم و کاست لکھ دیا ہے۔ ان نگارشات کا تسلسل اس کی اپنی یاد کا تسلسل ہے۔ یاد ہی کی دُھوپ چھاؤں میں مصنف کے ممدوح کے نقوش کبھی روشن کبھی دُھندلے دکھائی دیتے ہیں۔

اگر ایک سیّاح کی ڈائری کے بجائے یہ کتاب ایک سائنس داں کا تحقیقی مقالہ ہوتی تو ہم اس میں یقیناً جمادات اور نباتات کے تفصیلی بیان کی توقع کرتے۔ اس میں معدنیات کے ذخائر کا ذکر ہوتا۔ دریاؤں، لہروں، چشموں اور جھیلوں کی تفصیل ملتی ذرائع آمد و رفت کی وضاحت کی جاتی۔ غرض سائنس داں ہر ذرہ اور ہر پتّہ کا دل چیر کر ہمیں دکھاتا لیکن سیّاح کا یہ کام نہیں ہے۔ اس کی تصنیف کا حسن اور سُود مندی محض اس کے اپنے تاثرات کے خلوص اور صحت پر منحصر ہے۔ اور "روزگارِ فقیر" میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

روایتی تذکرہ نگار اپنے موضوع سے کبھی ہار نہیں مانتے! کسی کا مرقع حیات بناتے

وقت اگر کسی بارہ میں مصدقہ مواد یا معلومات کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ تو وہ کھینچ تان کے اپنے ذہن سے یہ کمی پوری کر لیتے ہیں۔ تذکرہ کو بھاری بھرکم بنانے کے لئے وہ اپنے ممدوح کے محاسن و معائب کے متعلق توضیحوں اور توجیحوں کے دفتر یا تنقید و تجزیہ کے طوُمار اس تندہی سے پھیلاتے ہیں کہ تذکرہ نویس کی اپنی ذات موضوعِ تذکرہ سے زیادہ اہم دکھائی دینے لگتی ہے۔ "روزگارِ فقیر" میں یہ بات نہیں ہے مصنف نے اقبال مرحوم کو پہلی دفعہ بچپن میں دیکھا تھا ——— ہر چند برسوں بعد تک مرحوم سے ان کی ملاقات رہی۔ لیکن اپنی کتاب میں انہوں نے شروع سے آخر تک بچپن ہی کے مخصوص تحیر، ادب اور نیاز مندی کا انداز قائم رکھا ہے۔ یہی خلوص اور انکسار "روزگارِ فقیر" کو اپنی نوع کی دوسری کتابوں سے ممیّز کرتا ہے۔ "روزگارِ فقیر" میں مصنف نے زبان اور طرزِ بیان میں بھی اسی انداز کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ اور سادگی کو تصنع اور بے ساختہ روزمرّہ کو مغلق، لفظی آرائش و زیبائش پر ترجیح دی ہے۔ چنانچہ پڑھنے والے کو "روزگارِ فقیر" سے کوئی گلہ ہو سکتا ہے۔ تو وہی جو مصنف کو خود اپنی ذات سے ہے یعنی یہ کہ ان کی یادداشت کا گنجینہ زیادہ بھرپور کیوں نہیں ہے۔ اور انہوں نے اپنی یادوں کو وقت اور فراموش گاری کی دستبرد سے بچانے کی بہت پہلے کوئی تدبیر کیوں نہیں کی۔ یہ گلہ ایک طرح اس کتاب کی دلچسپی اور افادیت کا اعتراف بھی ہے۔ اس لئے کہ کوتاہیٔ داستاں کی شکایت، حکایت کے لذیذ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اس لذت کے علاوہ جب تذکرہ اور سیرت کے ماہرین معلومات کا ریزہ ریزہ جمع کر کے حیاتِ اقبال کا لفظی قالب تیار کرنے بیٹھیں گے، تو اس تصنیف کو بہت مفید پائیں گے۔ اس تصنیف میں اقبال کی زندگی کے گھریلو روزمرّہ مناظر، ان کی نجی صحبتیں

اور رنجشیں، رحمتیں اور کلفتیں، ان کے دل کا گداز اور دماغ کی شگفتگی! اقبال کے آنسو اور اقبال کے قہقہے سبھی شامل ہیں۔ یہ بکھرے بکھرے اور غیر مکمل سہی لیکن ان کی تکمیل اور ترتیب کچھ ایسا مشکل کام نہیں۔

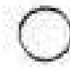
"روزگارِ فقیر" کے مصنف کا تفصیلی تعارف خود اس کتاب کے صفحات میں موجود ہے۔ یہاں غالباً صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ وہ لاہور کے معروف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس خاندان میں علم و فن کا چرچا کئی پشتوں سے چلا آتا ہے۔ اس گھرانے سے اقبال مرحوم کے مراسم ہی اس بات کے شاہد ہیں۔

کرنل وحید الدین صاحب کے بیشتر ایام سرکاری ملازمت میں گزرے ہیں۔ لیکن یہ تصنیف گواہ ہے کہ اپنے آبائی ورثہ سے وہ بھی محروم نہیں۔ "دانائے راز" کے عقیدتمندوں میں یہ کتاب یقیناً مقبول ہوگی۔

فیض احمد فیض

۲۰ جولائی ۱۹۵۰ء

(نقشِ اوّل میں شائع کیا گیا)



تبصرہ

از مولینا صلاح الدین احمد مدیر ادبی دنیا

جو "روزگارِ فقیر" کے نقشِ اوّل پر ریڈیو پاکستان لاہور سے ۱۹۵۱ء میں نشر کیا گیا

علامہ اقبال کی وفات کے بعد جسے آج کم و بیش تیرہ برس ہوئے ہیں ان کے فلسفے اور پیغام پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں بعض اچھی ہیں اکثر گوارا ہیں اور چند ایسی بھی ہیں جن کی اشاعت سے چھاپنے والوں کو کچھ فائدہ ہوا ہو تو ہو، پڑھنے والوں کو مطلق نہیں ہوا۔ بلکہ میری ناچیز رائے تو یہ ہے کہ متعدد مصنفین نے اقبال کے پیغام اور اس کے فکری نظریات پر اس حد تک خامہ فرسائی کی ہے کہ اس کی شاعری اور شخصیت —— ہماری نگاہوں سے بڑی حد تک اوجھل ہو گئی ہے۔ ایسے میں کسی ایسی کتاب کا شائع ہونا جو محض اس کی شخصیت پر ایک دل آویز انداز سے روشنی ڈالتی ہو مغتنمات میں سے ہے۔ میرا اشارہ اس حسین و جمیل تالیف کی طرف ہے جو حال ہی میں "روزگارِ فقیر" کے نام سے چھپ کر بصیرت افروز خاص و عام ہوئی ہے: "روزگارِ فقیر" کے مصنف فقیر سید وحید الدین کے نام سے مشہور و معروف ہیں: اور لاہور کے اُس نامور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو گذشتہ ڈیڑھ صدی

سے پایۂ تخت پنجاب کی علمی روایات کا خازن رہا ہے۔ مصنّف کے والدِ ماجد فقیر سیّد نجم الدین مرحوم علامۂ مغفور کے خاص احباب میں سے تھے اور مصنّف کو پہلے پہل اُن کی معیت میں، اور بعد ازاں اپنے طور پر حضرتِ علامہ کی خدمت میں مستقل طور پر حاضر رہنے اور اُن کے فیوض سے بہرہ مند ہونے کے بے شمار مواقع ارزانی ہوئے اور اگرچہ وہ بقول خود شروع شروع میں کہ اُن کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ اُس مردِ عظیم کی صحبت سے پورا فائدہ نہ اُٹھا سکے، لیکن جب سے اُنھوں نے ہوش سنبھالا یعنی اُن کے شعور میں پختگی پیدا ہوئی انھوں نے شاعرِ مشرق کے چشمۂ باطن سے سیراب ہو جانے کا کوئی امکانی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

کم و بیش ڈیڑھ سو صفحے کے اس مرقعِ جمیل میں جو عکسی چھاپے کا ایک شاہکار ہے مصنّف نے علامہ ممدوح کی شخصیت کے متعدد ایسے پہلو نمایاں کئے ہیں، جو اپنی نُدرت اور انفرادیت کے اعتبار سے اقبال کے طالب علم کے لئے غایت درجہ اہم اور قیمتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ حضرت علامہ کے اندازِ شعر گوئی کے متعلق روا روی میں ایک بڑے پتے کی بات پوری تفصیل سے قلم بند کر گئے ہیں، اور اپنے بیان کی تائید میں انھوں نے خود حضرت علامہ کی ایک گفتگو، ایک مخلص مگر کارواں سوانح نگار کے انداز میں یوں پیش کی ہے۔

"ایک دفعہ اُن کی طبیعت فراشگفتہ تھی یعنی باتیں کرنے کے "مُوڈ" میں تھے۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کے سوال کیا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ شعر کیسے کہتے ہیں؟ فرمایا ایک مرتبہ فارمن کرسچین کالج لاہور کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے مجھے بھی اس میں دعوتِ شرکت دی۔ اجلاس کا پروگرام ختم ہونے کے بعد چائے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ہم لوگ چائے پینے بیٹھے تو ڈاکٹر لوکس میرے پاس آئے اور کہنے لگے چائے پی کے چلے

نہ جانا۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ ہم لوگ چائے پی چکے تو ڈاکٹر لوکس آئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے اور کہنے لگے "اقبال! مجھے بتاؤ کہ تمھارے پیغمبر پر قرآن کریم کا مفہوم نازل ہوا تھا اور چونکہ انھیں صرف عربی زبان آتی تھی، انھوں نے قرآن کریم عربی میں منتقل کر دیا یا یہ عبارت ہی اس طرح اُتری تھی"۔ میں نے کہا "یہ عبارت ہی اُتری تھی"۔ ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر کہا کہ "اقبال! تم جیسا پڑھا لکھا آدمی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ عبارت ہی اس طرح اُتری ہے"؟ میں نے کہا "ڈاکٹر لوکس! یقین؟ میرا تجربہ ہے" مجھ پر شعر پورا اُترتا ہے تو پیغمبر پر عبارت کیوں نہیں پوری اُتری ہوگی"۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "جب شعر کہنے کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے تو یہ سمجھ لو کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جال ڈالا ہے۔ مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھنچی چلی آ رہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہو گیا ہے۔ سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کسے پکڑوں اور کسے چھوڑ دوں"۔ میں نے پوچھا "کیا آپ پر یہ کیفیت ہمیشہ طاری رہتی ہے؟" وہ کہنے لگے "نہیں یہ کیفیت تو مجھ پر سال بھر میں زیادہ سے زیادہ دو بار طاری ہوتی ہے، لیکن فیضان کا یہ عالم کئی کئی گھنٹے رہتا ہے اور میں بے تکلفی سے شعر کہتا جاتا ہوں۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ جب طویل عرصے کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو پہلی کیفیت میں کہا گیا آخری شعر دوسری کیفیت کے پہلے شعر سے مربوط ہوتا ہے گویا اس کیفیت میں ایک قسم کا تسلسل بھی ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ یہ فیضان کے لمحے دراصل ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان، عصبی اضمحلال اور پژمردگی سی محسوس کرتا ہوں"۔

تھوڑی دیر توقف کے بعد کہنے لگے کہ "ایک مرتبہ چھ سات سال تک مجھ پر کیفیت طاری رہی

نہ ہُوئی تو میں یہ سمجھا کہ خدا تعالےٰ نے مجھ سے یہ نعمت چھین لی ہے۔ چُنانچہ اس زمانے میں مَیں نے نثر لکھنے کی طرف توجہ کی۔ یک بیک ایک روز پھر یہی کیفیت طاری ہوگئی۔ ان لمحوں میں میری طبیعت ایک عجیب لذّت محسُوس کر رہی تھی۔ بس اَیسا محسُوس ہوتا تھا کہ اشعار کا ایک بحرِ مَوّاج ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے۔ یہ کیفیتِ سرُور و نشاط اتنی دیر تک قائم رہی کہ اُس نے چھ سات سال کے جمُود و تعطّل کی تلافی کر دی"۔ یہ کہہ کے وُہ لمحہ بھر کے لیے رُک گئے۔ اُن کے چہرے سے معلُوم ہوتا تھا کہ وُہ خیالات میں کھوئے ہُوئے تھے۔ پھر یکبارگی کہنے لگے "مشہُور جرمن شاعر گوئٹے کے متعلق ایک کتاب میں لکھا ہُوا ہے کہ جب اُس نے جرمن زبان میں قرآنِ کریم کا ترجمہ پڑھا تو اُس نے اپنے بعض دوستوں سے کہا کہ میں یہ کتاب پڑھتا ہُوں تو میری رُوح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعر کو بھی ایک قسم کا الہام ہوتا ہے۔ اس لیے جب وُہ کوئی الہامی کتاب پڑھتا ہے تو اپنی رُوح کو اس کی معنویت سے ہم آہنگ پاتا ہے اور اُس کی طبیعت ایک خاص اہتزاز محسُوس کرتی ہے۔ یہ چیز دُوسرے لوگوں کو نصیب نہیں ہو سکتی"۔

ہم نے یہ تفصیلی اقتباس نہ صرف علامہ اقبال کے اندازِ شعر گوئی پر روشنی ڈالنے کی غرض سے پیش کیا ہے، بلکہ اس سے ہمارا مدعا اُس فرقِ عظیم اور اُس بُعد و تضاد کی ایک توضیحِ صادقہ پیش کرنا بھی ہے جو اقبال کے شعری الہام اور اُس کے فکری نظام بالخصوص اس کے فلسفۂ سیاست ہندیہ میں پایا جاتا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اقبال نے ہمیں ایک قابلِ عمل سیاسی تصوّر دیا۔ لیکن اسے اُس آفاق گیر فلسفۂ حیات سے کیا نسبت ہے جو اس کے الہامِ شعر نے اُسے اور اُس کے توسط سے ملّتِ اسلامیہ کو ارزانی کیا ——— اقبال کے طالب علم بسا اوقات اس تضاد کی بھول بھلیوں میں گُم ہو کر رہ جاتے ہیں؛

لیکن اگر ان کے سامنے نزولِ شعر کا وہ منظر آ جائے جسے فقیر صاحب نے آج ہمارے سامنے رکھا ہے، اور وہ وجدانی کیفیت واضح ہو جائے جو اُس کے شعر کو اس کے سیاسی فلسفے سے علیحدہ اور ممتاز کرتی ہے، تو اُن کی بیشتر اُلجھنیں دور ہو سکتی ہیں۔ صاحبِ تالیف نے چند صفحات کے تن میں اقبال کی مجالس اور اس کی صحبتوں کی بہت سی نادر کیفیتیں اہلِ ذوق کے لئے اس انداز سے جمع کر دی ہیں کہ ہر ہر لفظ خلوص سے معمور اور صداقت سے آراستہ ہے۔ اور روانیٔ تحریر کا یہ عالم ہے کہ بعض دفعہ ناظر یوں محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ مصنّف کے زانو بہ زانو خود مجلسِ اقبال میں موجود ہے اور ان تمام کیفیات میں شریک ہے۔ جن کے ذکر سے اس تالیف کے صفحات جگمگا رہے ہیں۔ جب میں نے اس مردِ غیب کا ذکر پڑھا جس کا جذبِ شوقِ اقبال کے جواب میں خود اُسے اپنے طالب کے پاس لے آیا تھا۔ اور جو اپنا کام پورا کر کے یکایک نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ ابھی ابھی خود میری نظروں کے سامنے میرے کمرے کی نیم روشن فضا میں تحلیل ہو گیا ہے۔

مرقعِ زیرِ نظر جہاں شاعرِ مشرق کی سیرت کے متعدد حیرت ناک اور عمیق پہلوؤں کا آئینہ دار ہے، وہاں اس میں اُس کی شخصیت کے لطیف تر پہلو بھی نظر انداز نہیں کئے گئے مثلاً "حرفے زلبش شنیدہ ام" کے زیرِ عنوان کچھ ایسے لطائف بھی زیبِ نگارش ہیں جن سے اقبال کی پختہ ظرافت اور اس کے ذوقِ مزاح کا سراغ ملتا ہے: ایک لطیفہ تو ایسا ہے کہ اُسے سنائے بغیر چارہ نہیں۔ سنیئے!

اخبار وطن کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خاں، ڈاکٹر صاحب کے ہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے: ان دنوں ڈاکٹر صاحب انار کلی میں رہتے تھے، انار کلی میں کشمیری طوائفیں

بھی رہتی تھیں۔ میونسپلٹی نے دوسری جگہ تجویز کی: چنانچہ انھیں وہاں سے اٹھوادیا گیا۔ اس زمانے میں مولوی انشاءاللہ خاں کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے ملنے گئے۔ لیکن ہر مرتبہ یہی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب باہر گئے ہیں: اتفاق سے ایک دن جو گئے تو ڈاکٹر صاحب گھر پر موجود تھے: مولوی صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب جب سے طوائفیں انارکلی سے اٹھوادی گئی ہیں آپ کا دل بھی یہاں نہیں لگتا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔

"مولوی صاحب آخر وہ بھی تو وطن کی بہنیں ہیں"!

یہاں پر یہ نکتہ اگر یاد رکھ لیا جائے، کہ مولوی انشاءاللہ خاں "وطن" اخبار کے ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے معروف تھے اور خود ڈاکٹر اقبال کشمیری الاصل تھے تو لطیفے کا لطف دوچند ہو جاتا ہے: اور اگر اتنا اور بھی معلوم ہو کہ "وطن کی بہنیں" ممدوح کے مکان کے قرب و جوار سے اٹھ کر مدّاح یعنی صاحب تصنیف کے دولت کدے کے سائے میں آباد ہوگئی تھیں تو پھر اس کا لطف بیان کا محتاج نہیں رہتا۔

جیسا کہ مصنف نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے، وہ نسل اب بڑی تیزی کے ساتھ معدوم ہو رہی ہے: جس کے رجل —— کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں نے مشرق کے سب سے بڑے شاعر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس کی پُرشکوہ آواز جو آخر عمر میں ایک نحیف سی سرگوشی بن کر رہ گئی تھی: اپنے کانوں سے سُنی ہے: اور اس میں کیا کلام ہے کہ اس کے معدوم ہو جانے کے بعد کلامِ اقبال کا اس کے صحیح پس منظر پر جائزہ لینا آئندہ نسل کے بس کی بات نہیں رہے گی۔ علامہ مرحوم کے ہم عمر ساتھیوں میں سے جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اب صرف مولانا ظفر علی خاں، میر غلام بھیک نیرنگ، اور مرزا جلال الدین جیسے

درمیان باقی رہ گئے ہیں فقیر سید وحید الدین نے "روزگارِ فقیر" لکھ کر اہلِ ذوق کو ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دیکھیں وہ اس سے کس حد تک فائدہ اٹھاتے ہیں!

اور آخر میں علامہ مرحوم کے چند فارسی اشعار ملاحظہ فرمائیے: جو ان کے مجموعے میں نہیں ہیں: اور جو ایک واقعہ کی روداد کے سلسلہ میں درج کتاب کئے گئے ہیں:-

ہم نشین بے ریائم از رہِ اخلاص گفت

اے کلامِ تو فروغِ دیدۂ برنا و پیر

درمیانِ انجمن معشوقِ ہرجائی مباش

گاہ با سلطان باشی گاہ باشی با فقیر

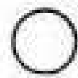
سلطان سے مرزا سلطان احمد اور فقیر سے مراد فقیر سید افتخار الدین مرحوم ہیں!

گفتمش اے ہم نشیں معذور می دارم ترا

در طلسمِ امتیازِ ظاہری ہستی اسیر

من کہ شمعِ عشق را در بزمِ جاں افروختم

سوختم خود را و سامانِ دوئی ہم سوختم



نقشِ اوّل

شرفِ حضور!

شاعرِ مشرق سے میری نیاز مندی کی کہانی ۱۹۱۶ء سے شروع ہوتی ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مُلکی فضا پر پہلی عالمگیر جنگ کا خونی کُہرا سا چھایا ہوا تھا۔ لیکن اس کُہرے میں پے بہ پے بجلی کوندرہی تھی۔ اس بجلی کی دمک سے کبھی رُوم وشام کے کارزاروں میں بہتا ہوا خونِ مسلماں جگمگا اُٹھتا تو کبھی ہند میں اپنے طوق وزنجیر جھنجھلانے لگتے۔

میں جب علی گڑھ کالج میں پڑھتا تھا۔ تیرہ چودہ برس کا سن ہوگا۔ شعوری طور پہ نہ مجھے اس کُہرے کا احساس تھا نہ ان بجلیوں سے شناسائی۔ لیکن اسی زمانے میں میری کورذہن نگاہیں اس صاحبِ کمال سے متعارف ہوئیں۔ جس نے ان بجلیوں کو اپنے خرمنِ فکر میں محفوظ کر رکھا تھا۔

کالج چند دنوں کے لئے بند تھا۔ میں چھٹی گزارنے لاہور پہنچا۔ حُسنِ اتفاق سے میرے والدِ مرحوم بھی سرکاری ملازمت سے چند دن کی رُخصت پر گھر تشریف لے آئے۔ اُن دنوں بچوں کو نہ صرف بزرگوں کی صُحبت میں نشست و برخاست کی عام اجازت تھی۔ بلکہ بعض اوقات انہیں ایسی محفلوں میں شرکت پر مجبور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ والدِ محترم کے بیشتر احباب سے میری روشناسی تھی۔ اِن میں مولوی احمد دین ایڈووکیٹ، سید محمد شاہ صاحب، شیخ گلاب دین



وکیل اور علامہ اقبال مرحوم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اُن دنوں زندگی فراغت سے اتنی عاری اور کشاکشِ ایام سے ایسی بھرپور نہ تھی۔ جیسی کہ اب ہے۔ احباب یک جا ہوتے تو گھنٹوں محفل جمی رہتی۔ صبح بیٹھتے تو شام تک ہر سبک اور گراں موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرتے۔ بیچ میں کوئی شگفتہ مضمون آن پڑتا۔ تو بھاٹی دروازہ میں ہمارے آبائی مکان کا دیوان خانہ بلند اور مسلسل قہقہوں سے گونج اٹھتا۔

مجھے گھر آئے دو دن گزرے تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ملازم نے آکے کہا "ابا بلا رہے ہیں"۔

والد صاحب کے قریب ایک صاحب صوفے پر دراز تھے۔

والد بزرگوار نے کہا "یہ میرا دوسرا لڑکا ہے"۔

صوفہ نشین صاحب نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور مجھے شفقت سے اپنے پاس فرش پر بٹھا لیا۔ یہ علامہ اقبال مرحوم سے میری پہلی ملاقات تھی۔

اس زمانہ میں اقبال مرحوم خوش رو اور خوش زیب نوجوان تھے۔ عام طور پر بڑھیا انگریزی لباس پہنتے۔ لیکن ہمارے ہاں آتے اور طویل صحبت کا سامان ہوتا۔ تو سوٹ اُتار کے دھوتی پہن لیا کرتے۔ اور واپسی پر دوبارہ سوٹ پہن لیتے۔ لباس سے مستقل بے اعتنائی انھوں نے چند سال بعد اختیار کی۔ جب وہ میکلوڈ روڈ والے مکان میں اُٹھ آئے تھے۔ اس کے بعد میں نے انہیں دھوتی اور بنیان کے علاوہ کسی اور ملبوس میں کم دیکھا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کالج کے متعلق مختلف سوالات پوچھنا شروع کئے جن کا میں اناپ شناپ جواب دیتا رہا۔ اس لئے کہ خود میرے دل میں بہت سے سوالات پوچھنے کے لئے

گدگدی ہو رہی تھی۔ ان دنوں لوگ انگلستان کے سفر کو عجب رشک اور استعجاب کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور کھاتے پیتے گھرانوں کے نوجوانوں کو تو دن رات انگلستان ہی کے خواب آیا کرتے میری بھی بہت دنوں سے یہی کیفیت تھی۔ علامہ مرحوم کے فکر و کلام کی عظمت کا تو کس کافر کو اندازہ تھا۔ کوئی تجسس تھا تو یہی کہ ان سے انگلستان کے قصے سنیں۔ پے در پے جانے کتنے سوال کر ڈالے وہ ہر ایک کا مسکرا کر جواب دیتے رہے۔ ضبط نہ ہو سکا تو میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ "انگلستان پہنچ کر لوگ اپنے نام فرنگیانہ بنا لیتے ہیں۔ آپ کو بھی چاہئے تھا کہ اپنا نام A. K. BALL رکھ لیتے"۔

ڈاکٹر صاحب نے بلا تامل جواب دیا "بھئی ہم نے تو نہیں کیا لیکن تم ولایت جاؤ گے تو اس نسخہ پر عمل کرنا۔ اور اپنا نام W. A. HEED رکھ لینا"۔ میں اس جواب سے کچھ لاجواب سا ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد کسی بہانہ سے کھسک آیا۔

اس پہلی ملاقات کے بعد علامہ مرحوم کو اکثر اپنے ہاں رونق افروز ہوتے دیکھا۔ اگر والد لاہور میں موجود ہوں تو شاید ہی کوئی دن جاتا ہو گا کہ اقبال ہمارے ہاں تشریف نہ لاتے ہوں یا والد ان کے ہاں نہ جاتے ہوں۔ اس لئے کہ ان بزرگوں کی دوستی محبت اور رفاقت کے اس مقام پر پہنچ چکی تھی۔ جہاں من و تو کے بیشتر حجابات اُٹھ جاتے ہیں جذباتی اُلجھنیں ہوں یا گھریلو مسائل، ماضی کا کوئی دکھ ہو یا مستقبل کا کوئی اندیشہ، ہنگامۂ شادی ہو یا سانحۂ غم، گزرا ہوا تجربہ ہو یا آنے والی مشکل، ہر بات میں باہمی اشتراک اور مشورت کو دخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دوست آپس میں ملتے تو ان کی طویل صحبتیں کچھ بہتے ہوئے پانی کا سا عالم یاد دلاتیں۔ کبھی سست خرام اور پُر سکوت۔ کبھی پُر شور اور طوفانی۔ خامشی کے لمحے تعطل کے بعد کبھی نہایت متین اور سنجیدہ گفتگو کی ہلکی ہلکی لہریں جنبش میں آتیں تو کبھی بذلہ سنجی اور

لطیفہ بازی کا ایسا غلغلہ بلند ہوتا کہ سارا گھر گونج اٹھتا۔ ان صحبتوں کی کیفیت میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ لیکن افسوس کہ ان کی تفصیل محو ہو چکی ہے۔ اتنا یاد ہے کہ گفتگو کے دوران جب کبھی باری تعالےٰ یا رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتا۔ تو علامہ مرحوم پر یکایک ایک وجدان سا طاری ہو جاتا اس موقع پر عام طور سے وہ آبدیدہ ہو کر خاموش ہو جاتے۔

علامہ مرحوم سے ہمارے خاندانی مراسم کی ابتداء اصل میں میرے درویش سیرت نانا فقیر سید افتخار الدین کے وسیلہ سے ہوئی۔ اقبال مرحوم اوائل عمر میں انہیں ملے لیکن جب بھی شاعرِ مشرق کے حال میں اُن کا مستقبل درخشاں تھا جس سے نانا مرحوم نہایت متاثر ہوئے۔ اسی توسط سے والدِ مرحوم سے رسمِ راہ شروع ہوئی۔ جو بعد میں ان مدارج پر پہنچی جن کا ذکر کر چکا ہوں۔

اور امور کی طرح میری تعلیم کے بارہ میں بھی والد مرحوم اپنے حبیب عزیز ہی سے رجوع فرمایا کرتے۔ چنانچہ جب اسکول سے فارغ ہو کے میں نے انگلستان جانے کی رٹ لگائی۔ تو حسبِ معمول ڈاکٹر صاحب سے مشورہ طلب ہوا۔ انہوں نے کہا کہ یہاں تعلیم مکمل کرنے سے پہلے انگلستان کی خاک چھاننا بے سود ہے۔ ان کی رائے کا احترام اس قدر تھا کہ میرا شدید اصرار خاک بھی کام نہ آیا۔

والد مرحوم ڈاکٹر صاحب کی صحبت کو مکتب و مدرسہ سے کہیں بہتر تعلیم گردانتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ رخصت پر آئے تو مجھے ہدایت فرما گئے۔ "کہ تمہارا پڑھنے میں جی نہیں لگتا۔ تو مت پڑھو لیکن یہ وعدہ کرو کہ ہر روز ڈاکٹر اقبال کے گھر صبح سے شام تک حاضر رہا کرو گے

اور ان کی گفتگو کو گہرے غور سے سنا کرو گے"۔ وعدہ تو کرنے کو میں نے کر لیا۔ لیکن شومیِ قسمت کہ اسے پورا کرنے کی سعادت میسر نہ ہوئی۔

چند ہفتوں کے بعد والد دوبارہ لاہور تشریف لائے۔ اور مجھے اپنے ہمراہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں لے گئے۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا۔ تو جب ہم باپ بیٹا ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچے تو عاشق بٹالوی ان کے پاس بیٹھے تھے۔ میں اعترافِ جرم پہلے ہی سے کر چکا تھا علیک سلیک کے بعد والد صاحب نے فرمایا۔ "اقبال میں جاتے ہوئے اسے ہدایت کر گیا تھا کہ ہر روز تمہارے پاس آیا کرے لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ نالائق ایک دفعہ بھی تمہارے پاس نہیں پہنچا"۔ ڈاکٹر صاحب بولے۔ "بھئی فقیر آخر جو کام باپ نے نہ کیا ہو وہ بیٹا کیوں کرے"۔ اس پر طویل قہقہہ پڑا۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی ہنسی میں کچھ دوستانہ شکوہ کی ملاوٹ بھی تھی۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک بزرگ کا واقعہ بیان کیا کہ وہ ہر وقت ایک عالم کی صحبت میں بیٹھے رہتے تھے اس کے علاوہ ان کا کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ جب اس عالم کا انتقال ہوا تو انھوں نے ایک نادر اور ضخیم کتاب لکھی۔ مجھے ندامت کا احساس اس قدر شدید تھا کہ میں اس واقعہ اور بزرگ کے متعلق ڈاکٹر صاحب سے مزید تفصیل دریافت نہیں کر سکا۔

ابتدائی ملاقاتوں کے بعد مجھے علامہ اقبال کی ذات سے اتنا لگاؤ ضرور ہو گیا تھا۔ کہ والد جب بھی گھر پر آتے تو عام طور سے علامہ مرحوم کا تذکرہ رہتا۔ کبھی ہم پوچھتے۔ کبھی وہ خود ہی بیان کرتے۔ بیشتر واقعات جو میں نے اس زمانہ میں والدِ مرحوم سے سُنے ہیں شاعرِ مشرق کی شخصیت کا ایک پہلو زیادہ اُجاگر کرتے ہیں۔ یہ پہلو سوز و گداز اور جذب و وجدان کا پہلو ہے۔

ایک واقعہ مجھے اب تک یوں یاد ہے۔ جیسے اسی گھڑی سننے میں آیا ہو۔ ایک شام والد صاحب علامہ مرحوم کے ہاں سے لوٹے اور آتے ہی یہ عجیب حکایت بیان کی۔

"ایک عجیب بات سنو۔ کل صبح میں اقبال کے ہاں گیا تو وہ گویا میرے منتظر بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی کھل گئے اور کہا اچھا ہوا فقیر تم آ گئے۔ سنا ہے کہ داتا گنج بخشؒ کی درگاہ میں آج کل کوئی بہت روشن ضمیر بزرگ قیام رکھتے ہیں۔ ان سے ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں سوال یہ ہے کہ جب مسلمانوں سے یہ وعدۂ ایزدی ہے کہ وہ اقوام عالم میں سرفراز اور سربلند ہوں گے تو آج کل یہ قوم اتنی ذلیل و خوار کیوں ہے۔ اچھا ہے تم بھی ساتھ چلو۔ اکیلے زحمت کون کرے۔ میں نے ہامی بھری۔ اور چلنے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ علامہ مرحوم ہاتھ پاؤں ہلانے میں ہمیشہ بہت تامل کرتے تھے۔ دو قدم چلنا ہو تو اس کے لئے گھنٹوں پہلے تیاری کی ضرورت پڑتی تھی۔ چنانچہ داتا گنج بخشؒ کے سفر کا فیصلہ ہوتے ہی انہوں نے علی بخش کو آواز دی اور کہا دیکھو ہم باہر جا رہے ہیں۔ ذرا جلدی سے فقیر کے لئے حقہ بھر دو۔ اور جا کر کچھ سوڈا لیمن وغیرہ لے آؤ۔ اس اہتمام میں حسب معمول جانے کتنا وقت نکل گیا۔ جب صبح سے دوپہر ہو گئی تو میں نے کہا۔ بھئی اقبال تمہارا کہیں جانے والنے کا ارادہ تو ہے نہیں۔ یونہی وقت ضائع کر رہے ہو۔ میں تو اب گھر چلا۔ اقبال اس پر کچھ چونک سے پڑے۔ اور کہا ہاں بھئی اب تو واقعی دھوپ تیز ہو گئی ہے۔ تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ لیکن یہ وعدہ کرو کہ شام کو ضرور آؤ گے۔ کچھ بھی ہو ہمیں ان بزرگ کے پاس ضرور جانا ہے۔ میں وعدہ کر کے چلا آیا۔ سہ پہر کو پھر پہنچا۔ لیکن پھر اسی طرح حقہ اور سوڈا لیمن میں دن ڈھل گیا۔ میں نے اقبال سے اس تساہل کا شکوہ کیا تو اقبال بہت ہی انکسار سے کہنے لگے بھئی اس دفعہ اور معاف کر دو صبح ضرور

چلیں گے۔

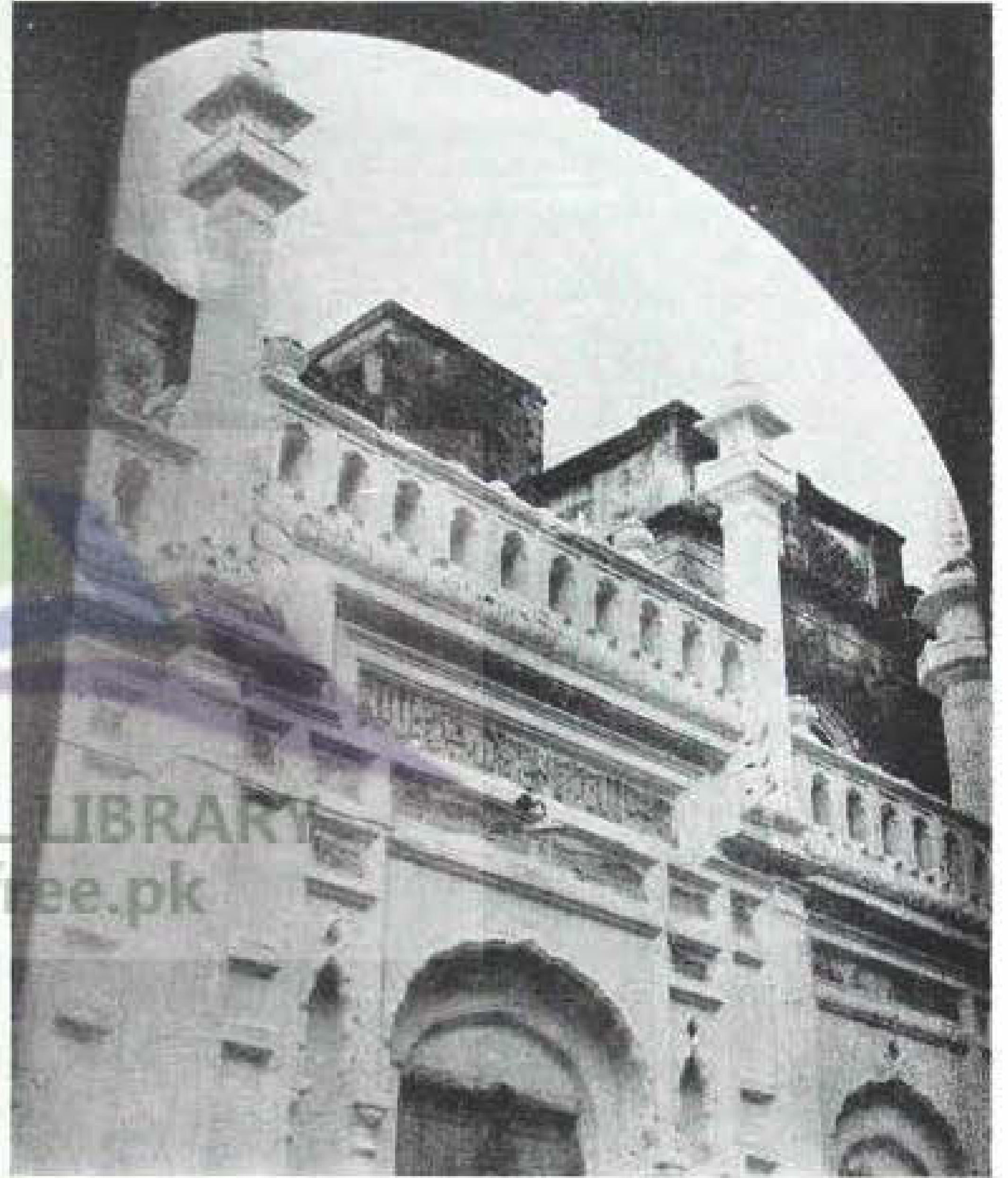
اگلی صبح میں عمداً دیر سے پہنچا۔ کوئی گیارہ بجے کا وقت ہو گا۔ اقبال کو دیکھا تو ان کی عجیب کیفیت تھی۔ رنگ زرد چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ تفکر اور اضطراب کا یہ عالم کہ جیسے کوئی شدید سانحہ گزر گیا ہو۔ میں نے پوچھا خیر تو ہے۔ کہنے لگے فقیر میرے قریب آ کر بیٹھو تو کہوں۔ آج صبح میں یہیں بیٹھا تھا۔ کہ علی بخش نے آ کے اطلاع دی کہ کوئی درویش صورت آدمی ملنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا بلا لو۔ ایک درویش صورت اجنبی میرے سامنے خاموش آکھڑا ہوا کچھ وقفہ کے بعد میں نے کہا فرمایئے۔ آپ کو مجھ سے کچھ کہنا ہے۔ اجنبی بولا "ہاں تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔ میں تمہارے سوال کا جواب دینے آیا ہوں۔" اور اس کے بعد مثنوی کا مشہور شعر پڑھا ؎

گفت رُومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند

تو نہ دانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

کچھ پوچھو نہیں کہ مجھ پر کیا گزر گئی۔ چند لمحوں کے لئے مجھے قطعی اپنے گرد و پیش کا احساس جاتا رہا۔ ذرا حواس ٹھکانے ہوئے تو بزرگ سے مخاطب ہونے کے لئے دوبارہ نظر اٹھائی لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ علی بخش کو ہر طرف دوڑایا لیکن کہیں سُراغ نہیں ملا۔"

والد مرحوم نے یہ واقعہ پہلے مجھے اور دوبارہ ایک دفعہ میرے پرانے دوست عاشق بٹالوی کو سنایا۔ جب عاشق بٹالوی نے کسی کا حوالہ دیئے بغیر ڈاکٹر صاحب سے اس واقعہ کی تصدیق چاہی تو انہوں نے فوراً کہا کہ تمہیں یہ واقعہ فقیر نجم الدین سے معلوم ہوا ہو گا۔ کیونکہ یہ میں نے صرف انہیں کو سُنایا تھا۔"



مسجد حسام الدین محلہ کشمیریاں سیالکوٹ علم و دانش کی پہلی تربیت گاہ
جہاں علامہ اقبال نے درس قرآن سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا

والد مرحوم نے ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کے متعلق ایک اور واقعہ سنایا۔ کہنے لگے "میں ایک دن ڈاکٹر صاحب سے ملنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں۔ اکیلے بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں میں نے کہا خیر باشد! گھر میں تو سب لوگ بخیر و عافیت ہیں؟ انہوں نے جواب دیا۔ ہاں سب بخیریت ہیں۔ میں نے پوچھا تو پھر آپ اس طرح کیوں رو رہے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دینے کی بجائے میری طرف ایک خط بڑھا دیا جو لندن سے اُسی دن ان کے نام آیا تھا۔ یہ خط انگلستان کے ایک پروفیسر¹ کی طرف سے تھا جس نے ڈاکٹر صاحب سے ان کی ایک فارسی کتاب کا ترجمہ کرنے کی اجازت مانگی تھی۔ میں نے تعجب سے کہا۔ اس خط میں ایسی کونسی بات ہے کہ تم نے یُوں رونا شروع کر دیا؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ دوسرے ملکوں کے اہل علم تمہارے کلام کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور یورپ کے لوگوں کو بھی اس سے آشنا کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جو اس وقت تک برابر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ سر اُٹھا کے میری طرف دیکھا اور پھر کہنے لگے۔ مجھے اس بات پر رونا آگیا کہ جس قوم کے دل میں احساس خودی پیدا کرنے کے لیے میں نے یہ کتاب لکھی تھی وہ نہ تو پوری طرح اس کا مطلب سمجھ سکتی ہے اور نہ اس کی قدر کر سکتی ہے۔ دوسری طرف ولایت والوں کا یہ حال ہے کہ وہ میرے پیغام کو اپنے ملک کے لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ کتاب میں نے ان کے لیے نہیں لکھی"۔

والد مرحوم سے ڈاکٹر صاحب کو بے حد محبت تھی۔ چنانچہ وہ جب والد مرحوم سے گفتگو کرتے تھے تو اس کا انداز کچھ ایسا بے تکلفانہ ہوتا تھا جس میں بیگانگی کا شائبہ تک نہیں پایا۔

---

¹ کیمبرج یونیورسٹی کے معلم شرقیات پروفیسر نکلسن جنھوں نے "اسرار خودی" کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔

جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ عام محفلوں میں گفتگو کرتے وقت کوئی لطیفہ، پھبتی یا چبھتا ہوا جملہ ایسا کہہ جاتے تھے۔ کہ خشک سے خشک مجلسیں بھی بامزہ معلوم ہونے لگتیں۔ بے تکلف دوستوں کے ساتھ جب گفتگو ہوتی۔ تو اس کا رنگ ہی اور ہوتا۔ کبھی ان کی طبیعت لہراتی تو ایک آدھ فقرہ یا کوئی پھبتی کہتے۔ والد مرحوم کو اُس نے وہ پہلے تو کچھ دیر ضبط کئے بیٹھے رہتے۔ فقرے اور پھبتیاں سنتے اور ہنس کے چپ ہو رہتے لیکن آہستہ آہستہ ان پر بھی یہی رنگ چھا جاتا۔ اور وہ بھی خوش طبعی پر اتر آتے۔ کبھی کبھی تو یہ نوک جھونک اس حد تک اعتدال کا پہلو لئے ہوتی کہ ہم ایسے نیاز مند بھی اس سے لطف اٹھاتے۔ لیکن جب خوش طبعی اور بے تکلفی کا رنگ ذرا تیز ہو جاتا تو مجھے اس محفل سے اٹھ جانا پڑتا یا یوں کہنا چاہیے کہ اٹھا دیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو قدرت نے عظمت کے جس بلند ترین مقام پر پہنچایا تھا۔ اس کا حال آپ جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ دوسروں کی تعریف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے ۔۔ خاص طور پر اپنے بے تکلف دوستوں کی خوبیوں کا ذکر تو اکثر موقعوں پر کرتے رہتے تھے۔ والد مرحوم کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا اور اسلامی تاریخ سے تو وہ خاص طور پر بڑا شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ کبھی مطالعہ خصوصاً اسلامی تاریخ کے مطالعہ کا ذکر آتا تو وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے۔ کہ اقبال جب کسی سے میرا تعارف کراتا ہے تو یہ بات خاص طور پر کہتا ہے کہ میرے دوست فقیر سید نجم الدین اسلامی تاریخ پر بڑی وسیع نظر رکھتے ہیں۔

شروع کے اوراق میں اس بات کا ذکر کر چکا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کا دل عشقِ رسول نے گداز کر رکھا تھا۔ زندگی کے آخری زمانہ میں تو یہ کیفیت ہو گئی تھی۔ کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کا ذکر آجاتا تھا تو ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے تھے اور آخر عمر میں یہ کیفیت اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ ہچکی بندھ جاتی تھی۔ آواز بھرا جاتی تھی اور وہ کئی کئی منٹ مکمل سکوت اختیار کر لیتے تھے تاکہ اپنے جذبات پر قابو پا سکیں اور گفتگو جاری رکھ سکیں۔

جب ڈاکٹر صاحب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپس آئے تو والد مرحوم ان سے ملنے گئے۔ بڑی مدت کے بعد ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس لئے بڑے تپاک سے ملے اور ڈاکٹر صاحب سے ان کے سفر کے تجربات کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ والد مرحوم نے اثنائے گفتگو میں کہا۔ "اقبال تم یورپ ہو آئے مصر اور فلسطین کی سیر بھی کی۔ کیا اچھا ہوتا کہ واپسی پر روضۂ اطہر کی زیارت سے بھی آنکھیں نورانی کر لیتے۔" یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ یعنی چہرے پر زردی چھا گئی۔ اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے تک یہی کیفیت رہی۔ پھر کہنے لگے "فقیر میں کس منہ سے روضۂ اطہر پر حاضر ہوتا؟"

میں شروع شروع میں والد مرحوم کی ہدایت کے باوجود ڈاکٹر صاحب سے دُور رہا۔ البتہ جب کبھی والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے دلچسپ واقعات سناتے۔ ان کی سادگی، خلوص، علمی تبحر اور شاعرانہ عظمت کا ذکر کرکے میرے شوق کو برانگیختہ کرتے۔ میں کبھی کبھی ان کی باتیں سن کے سوچتا۔ کہ سچ مچ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مدتیں ہو گئیں خدا نے چاہا۔ تو انہیں دنوں ان کی زیارت کروں گا کئی بار اپنے آپ سے اس قسم کا عہد کیا۔ لیکن اور قصوں میں پڑ کے بھول گیا۔ پھر جب بے شعوری اور نادانی کا وہ زمانہ جسے شباب کا ابتدائی دور کہنا چاہیے ختم ہوا۔ خیالات میں کسی قدر پختگی آئی۔ تو دل پر ڈاکٹر صاحب کی عظمت کا نقش زیادہ گہرا ہوتا گیا۔ طبیعت ان کی طرف

خود بخود کھنچنے لگی! اور میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہونا شروع کیا۔ چنانچہ کچھ عرصے میں کیفیت ہو گئی کہ جب کبھی فرصت کا تھوڑا سا وقت ملتا تھا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ اس "حضوری" میں ایسی لذت پائی کہ جو زمانہ دوری میں بسر ہوا تھا اس پر افسوس ہوتا تھا۔ اور بار بار خیال آتا تھا۔ کہ اے کاش ہم نشینی و یکجائی کی یہ سعادت پہلے نصیب ہوئی ہوتی

ڈاکٹر صاحب زیادہ تر خاموش رہتے تھے۔ میں نے جب انہیں دیکھا۔ کچھ نہ کچھ سوچتے ہی پایا۔ اور کبھی کبھی تو انہیں دیکھ کے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان کی نگاہیں اُفق کے اس پار بلکہ افلاک کی حد سے بھی آگے کسی چیز کو تلاش کر رہی ہیں۔ ایسے موقع پر کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی۔ کہ خود گفتگو کا سلسلہ چھیڑے۔ ڈاکٹر صاحب خیالات میں مستغرق ہوتے تھے۔ اور لوگ چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے یا گفتگو بھی ہوتی تھی۔ تو کچھ اُکھڑی اُکھڑی یعنی کسی نے کوئی بات پوچھی۔ اور ڈاکٹر صاحب نے جواب میں ایک آدھ مختصر سا جملہ کہہ دیا۔ اور پھر خاموشی چھا گئی لیکن یہ کیفیت ہمیشہ نہیں رہتی تھی۔ جب وہ بحث و گفتگو کی طرف جھک پڑتے تھے۔ تو گھنٹوں مسلسل باتیں کرتے چلے جاتے تھے! اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خیالات کا ایک سیلاب ہے جو اُمڈا چلا آرہا ہے۔

ایک دفعہ ان کی طبیعت ذرا شگفتہ تھی یعنی باتیں کرنے کے "موڈ" میں تھے۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کے سوال کیا کہ ڈاکٹر صاحب آپ شعر کیسے کہتے ہیں؟ فرمایا: "ایک مرتبہ فارمن کرسچن کالج لاہور کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے مجھے بھی اس میں دعوت شرکت دی! اجلاس کا پروگرام ختم ہونے کے بعد چائے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ہم لوگ چائے پینے بیٹھے۔ تو ڈاکٹر لوکس میرے پاس آئے اور کہنے لگے

چائے پی کے چلے نہ جانا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے ہم لوگ چائے پی چکے۔ تو ڈاکٹر لوکس آئے۔ اور مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے" اور کہنے لگے۔ اقبال! مجھے بتاؤ کہ تمہارے پیغمبر پر قرآن کریم کا مفہوم نازل ہوا تھا۔ اور چونکہ انہیں صرف عربی زبان آتی تھی، انھوں نے قرآن کریم عربی میں منتقل کر دیا۔ یا یہ عبارت ہی اس طرح اتری تھی میں نے کہا یہ عبارت ہی اتری تھی۔ ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر کہا۔ کہ اقبال تم جیسا پڑھا لکھا آدمی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ عبارت ہی اس طرح اتری ہے، میں نے کہا،

"ڈاکٹر لوکس! یقین! میرا تجربہ ہے! مجھ پر شعر پورا اُترتا ہے تو پیغمبر پر عبارت پوری کیوں نہیں اُتری ہوگی"!

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جب شعر کہنے کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے تو یہ سمجھ لو۔ کہ ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لئے جال ڈالا ہے۔ مچھلیاں اس کثرت سے جال کی طرف کھنچی چلی آرہی ہیں کہ ماہی گیر پریشان ہو گیا ہے۔ سوچتا ہے کہ اتنی مچھلیوں میں سے کسے پکڑوں اور کسے چھوڑ دوں۔

میں نے پوچھا: "کیا آپ پر یہ کیفیت ہمیشہ طاری رہتی ہے"

وہ کہنے لگے "نہیں یہ کیفیت تو مجھ پر سال بھر میں زیادہ سے زیادہ دو بار طاری ہوتی ہے لیکن فیضان کا یہ عالم کئی کئی گھنٹے رہتا ہے اور میں بے تکلفی سے شعر کہتا جاتا ہوں پھر عجیب بات یہ ہے کہ جب طویل عرصہ کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو پہلی کیفیت میں کہا گیا آخری شعر دوسری کیفیت کے پہلے شعر سے مربوط ہوتا ہے گویا اس کیفیت میں ایک قسم کا تسلسل بھی ہے یا یوں کہنا چاہئے۔ کہ یہ فیضان کے لمحے دراصل ایک ہی زنجیر کی

مختلف کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان عصبی اضمحلال اور پژمردگی سی محسوس کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر توقف کے بعد کہنے لگے کہ ایک مرتبہ چھ سات سال تک مجھ پر کیفیت طاری نہ ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ سے یہ نعمت چھین لی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں میں نے نثر لکھنے کی طرف توجہ کی۔ یک بیک ایک روز پھر یہی کیفیت طاری ہو گئی۔ ان لمحوں میں میری طبیعت ایک عجیب لذّت محسوس کر رہی تھی۔ بس ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اشعار کا ایک بحرِ مواج ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے۔ یہ کیفیت سرور و نشاط اتنی دیر تک قائم رہی کہ اس نے چھ سات سال کے جمود و تعطّل کی تلافی کر دی۔

یہ کہہ کے وہ لمحہ بھر کے لئے رُک گئے۔ ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خیالات میں کھوئے ہوئے تھے۔ پھر یکبارگی کہنے لگے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے متعلق ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ جب اس نے جرمن زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ پڑھا تو اس نے اپنے بعض دوستوں سے کہا کہ میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعر کو بھی ایک قسم کا الہام ہوتا ہے۔ اس لئے جب وہ کوئی الہامی کتاب پڑھتا ہے۔ تو اپنی رُوح کو اس کی معنویت سے ہم آہنگ پاتا ہے۔ اور اس کی طبیعت ایک خاص اہتزاز محسوس کرتی ہے۔ یہ چیز دوسرے لوگوں کو نصیب نہیں ہو سکتی "

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے واقعات میں ان کے "نائٹ ہُڈ" کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ جن دنوں انہیں سر کا خطاب ملا۔ پنجاب کی سیاسی فضا خاصی مکدر تھی۔ ترک

موالات کی تحریک کا زمانہ تھا۔ سودیشی کی تحریک زور پر تھی۔ انگریزی مال کے بائیکاٹ کے ساتھ ساتھ لوگ سرکاری ملازمتوں اور خطابات کے بائیکاٹ کو بھی فرض عین سمجھتے تھے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کو خطاب ملا۔ تو ان کے بعض دوست بہت جز بز ہوئے۔ اخبارات میں مضامین چھپے۔ فکاہی کالموں میں ان پر چوٹیں کی گئیں۔ ان دنوں مولانا ظفر علی خان اور سالک و مہر کی اخبار نویسی کے بڑے چرچے تھے۔ یہ لوگ اگرچہ ڈاکٹر صاحب کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ روز نہیں تو دوسرے تیسرے دن ان کے ہاں ضرور آتے تھے اور گھنٹوں صحبتیں رہتی تھیں۔ لیکن سب سے پہلے انہیں حضرات نے مخالفت کی! اور سالک صاحب نے تو ایک نظم بھی لکھ ڈالی جس کا یہ پھبتا ہوا مصرع "سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبالؔ" ان دنوں اکثر لوگوں کی زبان پر تھا۔ سالک صاحب کا بیان ہے کہ میں یہ اشعار لکھنے کے بعد اتنا نادم ہوا کہ مجھے عرصے تک ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد جی کڑا کر کے حاضر ہوا تو ڈاکٹر صاحب کے انداز میں میں نے کوئی فرق محسوس نہیں کیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں۔ مولانا ظفر علی خان کو بھی اسی طرح ندامت کا احساس تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو اپنے دوستوں کے اس طرز عمل پر نہ حیرت تھی نہ افسوس۔ بلکہ وہ یہ مضامین اور اشعار سن سن کے مسکراتے۔ اور کبھی کبھی تو ان اشعار کو پڑھوا کے سنتے اور داد دیتے۔

میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اس خطاب کی مبارک باد دینے حاضر ہوا تو ڈاکٹر صاحب پلنگ پر نیم دراز حقّہ پی رہے تھے۔ میں سلام کر کے بیٹھ گیا۔ پہلے مبارک باد دی۔ پھر لوگوں کے اعتراضات کا قصہ چھیڑ دیا کہنے لگے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں۔ مجھے یہ خطاب

کس طرح ملا۔ جس زمانے میں خطاب کی سفارش ہوتی۔ اس سے پہلے پنجاب کے چیف جسٹس سر شادی لال نے مجھے بلا کے کہا کہ مجھ سے گورنمنٹ نے خطابات کے لیے سفارشیں طلب کی ہیں۔ اور میں تمہارا نام خان صاحب کے خطاب کے لئے تجویز کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا میں اپنے لئے کوئی خطاب نہیں چاہتا۔ آپ زحمت نہ فرمایئے۔ وہ کہنے لگے اس قدر جلد فیصلہ نہ کرو بلکہ پہلے اچھی طرح غور کر لو۔ میں نے کہا۔ میں غور کر چکا مجھے خطاب کی ضرورت نہیں۔

دو تین دن کے بعد پھر سر شادی لال کا پیغام ملا۔ کہ مجھ سے مل جاؤ۔ میں نے پیغام بر کی زبانی کہلا بھیجا کہ خطاب کے سلسلہ میں مجھ سے گفتگو کرنا بے سود ہے کیونکہ میں جو فیصلہ ایک بار کر چکا سو کر چکا۔ ہاں اگر کوئی اور بات ہے۔ تو مجھے آپ سے ملاقات کرنے میں کوئی عذر نہیں۔ اس واقعہ کو کچھ دن گزرے تھے۔ کہ میکلگن صاحب گورنر پنجاب نے مجھے بلا بھیجا۔ بڑے تپاک سے ملے اور کہنے لگے آیئے آپ کو اپنے ایک دوست سے ملواؤں۔ ایک انگریز انہیں دنوں لاہور آیا تھا۔ اس نے میرا نام سن رکھا تھا۔ انگریزی میں اسرار خودی کا ترجمہ بھی پڑھا تھا۔ وہ گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا۔ اور مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اُس کے متعلق میری رائے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ غرض خاصی دیر تک صحبت رہی جب میں رخصت ہونے لگا تو ایک شخص یہ پیغام لے کر آیا کہ گورنر صاحب نے کہا ہے مجھ سے ملتے ہوئے جائیں! میں اُن کے کمرہ میں گیا۔ تو انہوں نے کہا۔ اقبال: مجھے انتہائی افسوس ہے کہ گورنمنٹ نے تمہاری ادبی خدمات کا اعتراف کرنے میں تساہل روا رکھا ہے: میں اس وقت خطابات کی سفارش کر رہا ہوں اور میری خواہش ہے کہ "نائٹ ہڈ" کے لئے تمہاری سفارش کی جائے: لیکن اس سے قبل معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو

نہیں: (واضح رہے کہ اُس زمانے میں حکومت کا یہ طریق کار تھا کہ خطاب پانے والے شخص کی طرف سے اس امر کا اطمینان کر لیا جائے) ڈاکٹر صاحب نے فرمایا! اسلام سماجی امتیازات SOCIAL DISTINCTION کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا لیکن اگر میرا یہ انکار گورنمنٹ کے جذبات مجروح کرنے کا باعث ہو تو مجھے تامل نہیں: میرے اس جواب سے میکلگن صاحب کے چہرے پر مسرت جھلکنے لگی۔

گورنر پنجاب ڈاکٹر صاحب کے خطاب کے بارے میں گفتگو کر چکے تو کہنے لگے شمس العلماء کے خطاب کے سلسلہ میں اس دفعہ پنجاب کی باری ہے۔ میں نے چند سرکردہ مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ موزوں نام تجویز کریں۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی مناسب نام ہو تو بتاؤ"!

میں نے کہا۔ اس شرط پر بتاتا ہوں۔ کہ اس کے بعد کسی اور نام پر غور نہ کیا جائے۔:

میکلگن صاحب نے اس اقرار سے پہلے کچھ تامل کیا۔ اور پھر کہا۔ اچھا تم نام بتاؤ۔

میں نے اپنے استاد مولوی سید میر حسن پروفیسر مرے کالج سیالکوٹ کا نام لیا۔ میکلگن صاحب فرمانے لگے اس سے قبل یہ نام نہیں سنا: اچھا یہ بتایئے کہ انہوں نے کون کونسی کتابیں تصنیف کی ہیں؟

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ کہ انہوں نے کوئی کتاب تو تصنیف نہیں کی۔ لیکن میں ان کی "زندہ تصنیف" آپ کے سامنے موجود ہوں جسے گھر بلا کر "سر" کے خطاب کی پیشکش کی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب گورنر پنجاب سے رخصت ہوئے اور چند قدم جا کر پھر واپس آ گئے اور کہا ایک اور شرط بھول گیا ہوں کہ اگر شمس العلماء کے خطاب کی سفارش منظور ہو جائے تو میرے

ضعیف العمر اُستاد کو یہ سند لینے کے لئے سیالکوٹ سے لاہور آنے کی زحمت نہ دی جائے۔

یہ شرط بھی مسٹر میکلگن نے منظور کر لی۔ چنانچہ مولوی صاحب کے خطاب کی سند ان کے صاحب زادے سید علی نقی شاہ کو جو گورنمنٹ ہاؤس میں بطور معالج ملازم تھے گورنر پنجاب نے عطا کی اور انہوں نے سند کو اپنے والد کے پاس سیالکوٹ پہنچا دیا۔

ڈاکٹر صاحب کے خطاب پانے کا واقعہ صرف اسی قدر ہے جسے لوگوں نے بہت طول دیا۔ اس پر حاشیہ آرائیاں کیں اور اس سارے قصّہ کو اس طرح پیش کیا۔ گویا ڈاکٹر صاحب خطاب پا کے سچ مچ اپنے سیاسی عقائد سے دست بردار ہو گئے تھے۔ برطانیہ کے معاملہ میں ان کی جو رائے خطاب پانے سے پہلے تھی۔ بعد میں بھی وہی رہی۔ انہوں نے خطاب پانے کے بعد جو نظمیں کہی ہیں۔ ان میں برطانیہ کی حکمت عملی پر جا بجا طنز کیا ہے۔ بلکہ طنز کے یہ نشتر پہلے سے زیادہ تیز ہو گئے ہیں:

میں جب کبھی اس واقعہ پر غور کرتا ہوں۔ تو حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کتنے بلند کردار اور شریف النفس شخص تھے کہ اس موقع پر بھی استاد کو نہ بھولے۔ اب نہ مولوی میر حسن جیسے استاد ہیں۔ نہ اقبال جیسے شاگرد۔ اور پھر ذرا اس بات پر بھی غور کیجئے کہ جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا۔ اقبال کی شہرت ہندوستان سے نکل کے یورپ میں پہنچ چکی تھی۔ دوسرے ملکوں کے علمی طبقوں میں ان کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا تھا۔ اور مولوی میر حسن جو پہلے تھے اب بھی وہی تھے معدودے چند لوگوں کے جنہیں ان کی خدمت میں بیٹھنے یا ان سے پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ عام لوگ ان کی عظمت سے واقف نہ تھے۔

پھر بھی اقبال ہمیشہ ان کی عظمت کا اعتراف کرتے رہے اور اس معاملہ میں حفظ مراتب

سے غافل نہیں ہوئے۔

بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شہرت کے تذکرہ کے ضمن میں ایک واقعہ یاد آگیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہزارہا عقیدت مند دنیا کے دور دراز گوشوں میں موجود تھے۔ ایک مرتبہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ پلنگ پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے مجھے دیکھ کے کتاب بند کر دی۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں پلنگ سے ذرا ہٹ کے ایک قالین پڑا تھا جس کی رنگت اور گل بوٹے آنکھوں میں کھبے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب آپ نے یہ نیا قالین خریدا ہے کہنے لگے اس قالین کا قصہ بھی عجیب ہے۔ آج صبح ایک شخص جس کا میں نام تک نہیں جانتا یہ قالین لے کے آیا اور کہنے لگا میں دو تین دن ہوئے فریضۂ حج ادا کر کے لاہور پہنچا ہوں۔ ایران کی سیر کا مدت سے شوق تھا۔ اس لئے واپسی پر ایران کا راستہ اختیار کیا۔ طہران میں جن صاحب کے ہاں میرا قیام تھا۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں پنجاب سے آیا ہوں۔ اور حج کر کے اپنے وطن واپس جا رہا ہوں۔ تو انہوں نے مجھ سے پوچھا تم نے کبھی حضرت اقبال کو دیکھا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں کئی مرتبہ! یہ سنتے ہی وہ اُٹھ کے میری طرف بڑھے۔ میری آنکھوں کو بوسہ دیا! اور پھر دیر تک بڑے اشتیاق سے آپ کے حالات پوچھتے رہے۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو گھر میں سے یہ قالین نکال لائے اور کہنے لگے کہ لاہور پہنچ کر میری طرف سے یہ قالین ان کی خدمت میں پیش کر دینا۔ یہ قالین آپ کے ایک ایرانی عقیدت مند کا تحفہ ہے جو میں اُس کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش کرنے حاضر ہوا ہوں۔

میں یہ سطور لکھ رہا ہوں اور میرے سامنے ایک کتاب پڑی ہے۔ جو اسپین کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کتاب کا نام SPAIN FROM THE SOUTH ہے اور مصنف کا نام J. B. TREND ۔ کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر صاحب کے دستخط ہیں۔ اور ان کے نیچے ۲ جنوری ۱۹۳۵ء لکھا ہوا ہے۔ یہ کتاب مجھے ڈاکٹر صاحب نے مرحمت فرمائی تھی۔ اور میں اسے بڑی عزیز متاع سمجھتا ہوں۔ اس کتاب پر نظر پڑتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ جب وہ تیسری گول میز کانفرنس سے واپس آئے تو میں والد مرحوم کی معیت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان دنوں والد مرحوم کے فیضِ محبت سے مجھ میں اسلامی تاریخ کا خاصا ذوق پیدا ہو چلا تھا۔ سپین کے متعلق کئی کتابیں جن میں سکاٹ اور لین پول کی تصانیف شامل تھیں۔ میری نظر سے گزر چکی تھیں۔ میں نے یہی تذکرہ چھیڑ دیا۔ اور سپین کے اسلامی عہد کی تاریخ کا ایک حصہ جو مجھے حفظ ہو گیا تھا۔ فر فر سنا دیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ پھر اسپین کی موجودہ حالت کا ذکر چھڑ گیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے سفر میں سپین بھی گئے تھے۔ اور اسی زمانے میں انھوں نے مسجد قرطبہ پر ایک نظم بھی لکھی تھی۔ جو ان کی مشہور نظموں میں سمجھی جاتی ہے۔ وہ جب قرطبہ پہنچے اور وہاں کی مسجد دیکھنے گئے۔ جو انقلابِ زمانہ کی بوقلمونی سے گرجا بن چکی ہے۔ تو انہوں نے ایک پادری سے جو مسجد کی نگہبانی پر مامور تھا۔ وہاں نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ پادری نے یہ سن کے تامل کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا تعجب ہے۔ تم مسیحی ہم سے اس قسم کا سلوک روا رکھتے ہو، حالانکہ ہم نے تم سے کبھی اس قسم کا سلوک نہیں کیا تھا۔ وہ پادری اس فقرہ سے کسی قدر متاثر ہوا۔ اور کہنے لگا۔ آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں بڑے پادری سے پوچھ کے آتا ہوں۔ لیکن جب تک وہ واپس آیا۔ ڈاکٹر صاحب نماز پڑھ چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ واقعہ سنانے کے بعد کہا تعجب کی بات یہ



حکیم الامت علامہ اقبال مسجد قرطبہ (سپین) میں

اسلامی دورِ اقتدار ختم ہونے کے تقریباً سات سو سال بعد انھوں نے یہاں پہلی بار اذان دی اور نماز پڑھی

ہے کہ مسلمانوں نے سپین پر آٹھ سو برس حکمرانی کی لیکن اس سرزمین میں کسی مسلمان کا نشان مزار تک نظر نہیں آیا۔

اسی سفر میں وہ اٹلی بھی گئے۔ اور وہاں انہیں مسولینی سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہ ساری کیفیت میں نے خود ان کی زبانی سنی ہے۔ انہوں نے خود مسولینی سے ملنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ بلکہ جن دنوں وہ روما میں مقیم تھے مسولینی نے اپنے سٹاف کے آدمی کے ذریعے انہیں کہلا بھیجا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے دعوت قبول کر لی اور مسولینی سے ملنے تشریف لے گئے۔ وہ ایک بڑے وسیع کمرے میں میز کے قریب بیٹھا تھا۔ میز پر کاغذوں کا انبار تھا۔ ڈاکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو وہ پیشوائی کے لئے بڑھا۔ اس کا قد زیادہ اونچا نہیں تھا۔ لیکن بازو بھرے ہوئے تھے۔ سینہ کشادہ اور آنکھیں شکرے کی آنکھوں کی طرح چمکیلی تھیں۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد اس نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا میری فاشسٹ تحریک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب دیا آپ نے ڈسپلن کے اس اصول کا بڑا حصہ اپنا لیا ہے جسے اسلام انسانی نظام حیات کے لئے بہت ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن اگر آپ اسلام کے نظریہ حیات کو پوری طرح اپنا لیں۔ تو سارا یورپ آپ کے تابع ہوگا۔ لیکن یہ ایسی بات نہیں تھی کہ مسولینی کے ذہن میں آسانی سے آجاتی۔

ڈاکٹر صاحب نے مسولینی کو یہ مشورہ بھی دیا

TURN YOUR BACK TOWARDS EUROPE

(یعنی یہ کہ یورپ جس معاشرہ کی ترقی کا داعی ہے تم اس کی تقلید سے اجتناب کرو)

مسولینی نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ میں دنیا کے مسلمانوں کی ہمدردیاں کس

طرح حاصل کر سکتا ہوں؟

ڈاکٹر صاحب نے کہا مفت تعلیم اور رہائش کا انتظام کر کے زیادہ سے زیادہ مسلمان طلباء کو اٹلی بلایئے۔

مسولینی نے ڈاکٹر صاحب سے کوئی اچھوتا مشورہ بھی طلب کیا۔ انہوں نے کہا "ہر شہر کی آبادی مقرر کر کے اسے حد سے نہ بڑھنے دو، اس سے زیادہ بسنے والوں کو نئی بستیاں مہیا کی جائیں" مسولینی نے حیران ہو کر کہا۔ اس میں کیا مصلحت ہے؟

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ شہر کی آبادی جس قدر بڑھتی جاتی ہے۔ اس کی تہذیبی و اقتصادی توانائی کم ہوتی جاتی ہے۔ اور ثقافتی توانائی CULTURAL FORCES کی جگہ EVIL FORCES "محرکات شر" لے لیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا یہ میرا ذاتی نظریہ نہیں ہے بلکہ میرے پیغمبر نے آج سے تیرہ سو سال قبل یہ مصلحت آمیز ہدایت فرمائی تھی۔ کہ جب مدینہ منورہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو مزید لوگوں کو آباد ہونے کی اجازت دینے کی بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے۔

یہ حدیث سنتے ہی مسولینی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اور دونوں ہاتھ میز پر زور سے مار کر کہا۔ WHAT AN EXCELLENT IDEA

یعنی کتنا حسین تخیل ہے!

(تحقیق کے طالب حضرات اس نکتہ پر غور و تجسس کر سکتے ہیں، کہ ایٹمی توانائی اور جنگی تباہی کے اس ہولناک دور میں یہ نظریہ کس قدر مصلحت اور افادیت لئے ہوئے ہے)

ڈاکٹر صاحب مسولینی سے دیر تک گفتگو کرتے رہے جب وہ اس سے رخصت ہوئے

تو لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور تقاضا کرنے لگے۔ کہ آپ ہمارے لیڈر کے متعلق اپنی رائے دیجئے۔ ڈاکٹر صاحب اس موضوع پر کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے لیکن لوگ راستہ روکے کھڑے تھے۔ اور ہجوم سے موٹر نکال کے لے جانا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ آخر مسولینی کے سٹاف کے آدمیوں نے کہا کہ ان لوگوں سے جان چھڑانا مشکل ہے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ کہہ دیجئے۔ یہ سُن کے ڈاکٹر صاحب نے ہجوم کو مخاطب کرکے فرمایا "مسولینی بغیر بائبل کے لُوتھر ہے" یہ فقرہ اطالوی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اور ہجوم میں بار بار دُہرایا گیا۔ لوگ سن کے خوشی سے ناچنے لگے اور اسی وقت بڑے بڑے پوسٹر جن پر یہ فقرہ درج تھا۔ چھاپ کے در و دیوار پر چسپاں کر دیئے گئے۔

مسولینی سے ڈاکٹر صاحب کی اس ملاقات اور ان کی ایک نظم سے جو انہوں نے مسولینی کے متعلق لکھی ہے بعض لوگوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کا رجحان بھی فاشزم کی جانب تھا۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ مسولینی نے اپنے ملک کے لوگوں میں جو تنظیم پیدا کر دی تھی اسے وہ پسند کرتے تھے۔ کیونکہ اسلام کی حقیقی رُوح بھی تنظیم ہے۔ اور ان کی عادت تھی۔ کہ جب کسی تحریک میں انہیں کوئی ایسی بات نظر آتی تھی جو اسلامی اصولوں سے مشابہ معلوم ہوتی تھی۔ تو وہ اس کی تعریف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ ورنہ یہ سب کو معلوم ہے کہ جب مسولینی نے حبشہ پر قبضہ کر لیا۔ تو انہیں سخت صدمہ ہُوا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مشہور نظم "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" لکھی جس میں یورپ والوں کی ہوس ملک گیری کا ذکر نہایت تلخ انداز میں کیا گیا ہے۔

اپنے عہد کے جن بزرگوں سے ڈاکٹر صاحب کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ ان میں اکبر الٰہ آبادی

بھی تھے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ اکبر مرحوم سے میری بڑی دلچسپ خط و کتابت رہی ہے اور میرے پاس وہ تمام خطوط بحفاظت موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد میں نے چودھری محمد حسین صاحب کو ان خطوط کی اشاعت کی جانب متوجہ کیا۔ اور انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ انہیں خود ان خطوں کو چھاپنے کا خیال ہے۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے ڈاکٹر صاحب کے نام جو خط لکھے ہیں۔ ان میں بھی ڈاکٹر صاحب کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا گیا ہے جن سے گہری وابستگی اور تعلق خاطر کا پتہ چلتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو آم بہت مرغوب تھے۔ ایک مرتبہ اکبر نے الٰہ آباد سے ان کے لئے لنگڑا آم کی ایک پیٹی بھجوائی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی رسید میں یہ شعر لکھ بھیجا۔

اثر یہ تیرے اعجازِ مسیحائی کا ہے اکبرؔ
الٰہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک آیا

ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے۔ کہ جو دعا دل کی گہرائیوں سے نکلے ضرور قبول ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ دعا کا اثر فوراً ظاہر ہو۔ بعض دعائیں تو ایسی بھی ہوتی ہیں۔ جن کا اثر کہیں موت کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی بڑی مختصر ہے۔ اور نظامِ کائنات بہت وسیع ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس قول کی تصدیق ان کی زندگی کے واقعات سے ہوتی ہے۔ جو لوگ ان کی زندگی کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب تیسری شادی کے بعد مدت تک اولاد سے محروم رہے۔ جب وہ قریب قریب اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے۔ تو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی درگاہ میں حاضر ہو کے دعا کی۔ کہ اللہ انہیں ایک بیٹا عطا کرے۔ جسے وہ اپنی زندگی میں اعلیٰ تعلیم دے سکیں۔ لیکن اس واقعہ کو بھی پانچ چھ برس

گزر گئے! اور ان کی دعا قبول نہ ہوئی۔ ایک دن شام کو وہ گھر گئے تو دیکھا۔ کہ جاوید کی والدہ طوطے کے بچے کو اپنے پاس بٹھا کے بڑی شفقت سے پھل کھلا رہی ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کے ڈاکٹر صاحب کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے۔" الٰہی! اس خاتون میں مادرانہ شفقت پیدا ہو چکی ہے۔ اب اسے اولاد بھی عطا فرما۔" یہ دعا قبول ہوئی۔ چنانچہ اسی سال جاوید سلمہٗ تولد ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کو جاوید میاں سے جس قدر محبت تھی۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جو ان کی خدمت میں روز حاضر ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب طبعاً بڑے خاموش اور سنجیدہ بزرگ تھے۔ لیکن جب کبھی وہ جاوید کو آواز دے کے بلاتے۔ اسے کھیلتے ہوئے دیکھتے یا احباب اس کا ذکر کرتے۔ تو پدرانہ شفقت ان کے دل کو گداز کر دیتی۔ اور ان کی آنکھیں نم آلود ہو جاتیں۔ کبھی کبھی رخساروں پر آنسو بہنے لگتے۔ پیشانی پر زاویے ابھرتے اور مٹ جاتے۔ وہ جاوید سلمہٗ کو نصیحتیں کرتے۔ اپنے پاس بیٹھنے پر زور دیتے۔ لیکن کبھی میں نے یہ بھی دیکھا ہے۔ کہ جاوید کا ذکر کرتے کرتے ان کا دل ڈوب سا جاتا۔ اور وہ یک بیک خاموش ہو جاتے۔

جن دنوں ڈاکٹر صاحب افغانستان کی سیاحت سے واپس آئے۔ تو میں والد محترم کے ہمراہ ان سے ملنے گیا۔ والد محترم نے اس موقع پر پیامِ مشرق کی اس نظم کا ذکر چھیڑ دیا جس میں شاہ افغانستان سے خطاب کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تازہ کتاب "مسافر" کا ذکر کیا۔ جو انہوں نے افغانستان کے سفر کے زمانے میں لکھی تھی۔ اتنے میں جاوید میاں باہر سے کھیلتے کھیلتے کمرے میں آ گئے۔ والد مرحوم نے ان کا ہاتھ پکڑ کے بڑی شفقت سے پوچھا۔

"تمہارا باپ تو بادشاہوں کو سبق دیتا
ہے۔ بڑے ہو کے تم کیا کرو گے؟"

یہ سُن کے ڈاکٹر صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ اور کہنے لگے۔ "نجم الدین۔ میرے دل کا بادشاہ تو یہی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کو اسلام سے بڑی شیفتگی تھی۔ سر عبدالقادر مرحوم کے قول کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ ماں کے دودھ کے ساتھ اسلام ان کی رگ و پے میں نفوذ کر گیا تھا انہوں نے اسلام کی تعلیمات کا مطالعہ بڑے غور سے کیا تھا۔ اور اسے خوب سمجھا تھا اس کے ساتھ ساتھ وہ دنیا کے دوسرے مذاہب کے متعلق بھی جو کچھ کہتے تھے۔ وہ بہت وقیع ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ایک پادری ان سے ملنے آیا۔ اور اثنائے گفتگو میں پوچھنے لگا۔ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق اسلام کیا کہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ اس سے پہلے کہ میں اس معاملہ میں اسلام کا نقطہ نظر بیان کروں آپ بتائیے۔ کیا عیسویت کے نزدیک جناب مسیح علیہ السلام اسی طرح خدا کے بیٹے تھے جس طرح میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں۔ یا آپ اپنے باپ کے بیٹے ہیں یا محض استعارہ کے طور پر مسیح کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے پادری نے جواب دیا۔ نہیں یہ تو صرف استعارہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "تو بس اسلام کا نظریہ بھی یہی ہے۔"

اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو لندن کے ایک اجتماع میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ جہاں صرف اسلامیات کے متعلق تقریریں ہو رہی تھیں اس اجتماع میں مختلف نسلوں کے تعلیم یافتہ لوگ موجود تھے۔ لوگوں کے اصرار پر حکیم الامت نے بھی ایک تقریر کی جس میں انہوں نے اسلام کے اصولوں پر روشنی ڈالی جب وہ تقریر ختم کر چکے۔ تو ایک انگریز ان کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ آپ نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا

ہے۔ اگر یہی اسلام ہے تو ہم سب مسلمان ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ کسی کو برسرِ عام یہ بات کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب صحیح معنوں میں مردِ خود آگاہ تھے یعنی اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں سے زیادہ اپنی خامیوں پر نظر رکھتے تھے۔ انہیں کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ اکثر لوگوں کو ان سے مل کے مایوسی ہوتی ہے۔ کیونکہ لوگ ان کا کلام پڑھ کے اپنے ذہن میں ان کے متعلق جو نقشہ قائم کر لیتے ہیں۔ اس پر وہ پورے نہیں اُترتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے خواجہ حسن نظامی کو لکھا تھا۔ کہ آپ لوگوں سے میرا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ان کے دل میں مجھ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے۔ اس پر مجھے اعتراض تو نہیں البتہ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ انہیں مجھ سے مل کے کہیں مایوسی نہ ہو اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ بعض لوگ انہیں شاعر سمجھ کے ان سے شاعروں کے سے تکلف اور تصنع کی توقع رکھتے تھے۔ بعض حضرات ایسے بھی تھے۔ جو ان سے ملنے آتے تھے اور چھوٹتے ہی شعر سنانے کی فرمائش کر دیتے تھے۔ خاص طور پر بعض شعرا کا جو ان کی طبیعت سے ناواقف تھے۔ یہی انداز تھا۔ وہ اس خیال سے ان سے ملنے آتے تھے۔ کہ گھڑی دو گھڑی بیٹھیں گے۔ اپنا کلام سنائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کا کلام سنیں گے لیکن ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کا انداز عام شاعروں سے مختلف تھا۔ انہیں خودنمائی سے نفرت تھی۔ نہ مشاعروں میں جاتے تھے۔ نہ نجی صحبتوں میں شعر سنتے اور سناتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا جو میں نے خود ان کی زبانی سنا تھا نواب ذوالفقار علی خاں مرحوم کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب ان کی دعوت پر ڈیرہ دون تشریف لے گئے۔ وہاں اتفاق سے ان دنوں

نواب صاحب رام پور بھی آئے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے نواب ذوالفقار علی خان کو کھانے پر بلایا۔ اور ساتھ یہ بھی کہلا بھیجا کہ سنا ہے آپ کے دوست ڈاکٹر اقبال بھی ان دنوں یہیں ہیں۔ انہیں اپنے ساتھ ضرور لے آیئے۔ مجھے ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔ نواب ذوالفقار علی خاں نے ذکر کیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ لیکن جب نواب صاحب نے اصرار کیا۔ تو کہنے لگے۔ کہ میں ایک شرط پر چلنے کے لئے تیار ہوں۔ کہ نواب صاحب رام پور جو شاعروں کے بڑے قدردان سمجھے جاتے ہیں۔ بلکہ خود بھی شعر کہتے ہیں نہ تو مجھ سے شعر سُنانے کی فرمائش کریں۔ نہ خود اپنے اشعار سُنائیں۔ نواب ذوالفقار علی خان نے یہ شرط بادلِ نخواستہ منظور کر لی۔ نواب صاحب رام پور کو بھی اس بات کی اطلاع کر دی گئی چنانچہ انہوں نے اپنا کلام سُنایا۔ نہ ڈاکٹر صاحب سے شعر سنانے کی فرمائش کی۔

غیروں کو تو جانے دیجئے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے خاص خاص نیازمندوں کو بھی کبھار ہی اپنا تازہ کلام سناتے تھے۔ مجھے سالہا سال ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوتا رہا ہے لیکن صرف ایک مرتبہ ان کی زبان سے ان کا ایک شعر سُنا۔ یہ شعر 'بالِ جبریل' میں موجود ہے۔ لیکن اس زمانے میں 'بالِ جبریل' ابھی شائع نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس کا مسودہ ضرور زیرِ ترتیب تھا۔ وہ شعر یہ ہے ؂

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

ڈاکٹر صاحب کو اپنے استاد مولوی سید میر حسن مرحوم سے جو محبت اور عقیدت تھی اس



ڈاکٹر صاحب کے اُستاد شمس العلماء مولوی سیّد میر حسن مرحوم

کا ذکر ان کے خطاب کے تذکرہ میں آچکا ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے۔ کہ ڈاکٹر صاحب جب مولوی صاحب مرحوم کا ذکر کرتے تھے۔ ان کی آنکھیں پُرنم ہوجاتی تھیں۔ اکثر کہا کرتے تھے۔ کہ اُسوۂ رسُولؐ پر صحیح معنوں میں اگر کسی شخص کا عمل ہے۔ تو وہ مولوی سیّد میر حسن سیالکوٹی ہیں۔ وہ اکثر مولوی صاحب کے ہاں کی پُرلطف صحبتوں کا ذکر کرتے تھے! اور کہتے تھے کہ ان کے ہاں ہمیشہ اہلِ علم کی محفل جمی رہتی تھی۔ اور گھنٹوں مختلف مسائل پر بڑی دلچسپ بحثیں ہوتی تھیں اس سلسلے میں انہوں نے مولوی صاحب کی زندگی کے کئی دلچسپ واقعات بھی سنائے۔ ایک روز کہنے لگے۔ کہ ایک مرتبہ مرے کالج کے کسی انگریز پروفیسر نے ان سے کہا مولوی صاحب آپ کا خدا بہت سُست معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ پانچ دفعہ اذان دے کے اُسے جگاتے ہیں مولوی صاحب نے جواب دیا۔ اور آپ کا خدا ہمارے خدا سے ۲۵ گنا زیادہ سُست ہے کیونکہ ہفتہ بھر گھنٹے بجا بجا کے اُسے جگاتے رہتے ہیں۔ اور وہ پھر بھی نہیں جاگتا۔"

مولوی صاحب کی وضع داری کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ایک دفعہ انہیں ایم اے او کالج علی گڑھ کی پروفیسری پیش کی گئی۔ انہوں نے جواب میں لکھا مرے کالج سیالکوٹ کی آمدنی سے میری تین پشتوں یعنی میرے والدین۔ میری اولاد اور خود میں نے پرورش پائی ہے اس لئے میں اس کالج کو چھوڑ نہیں سکتا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے استاد کا جس قدر احترام کرتے تھے! اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ انہیں مولوی صاحب کو اپنا کلام سنانے کی جراٗت بھی نہیں ہوتی تھی۔ ایک دفعہ کہنے لگے۔ زندگی بھر میں ان کے سامنے صرف ایک مرتبہ میری زبان سے ایک مصرع نکل گیا۔ وہ بھی اتفاقی طور پر مولوی صاحب کسی کام کے لئے گھر سے نکلے ایک بچہ جوان کے عزیزوں میں تھا

اور جس کا نام "احسان" تھا۔ ان کے ساتھ تھا۔ مولوی صاحب کہنے لگے اقبال اسے گود میں اٹھا لو۔ میں نے اُسے گود میں اٹھا لیا۔ کچھ دُور جا کے میں تھک گیا چنانچہ میں نے بچے کو تو ایک دکان کے تختوں پر کھڑا کر دیا! اور خود سستانے لگا۔ مولوی صاحب اتنے میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ ہمیں اپنے ساتھ نہ پایا۔ تو اُلٹے پاؤں لوٹے۔ اور میرے قریب آ کے فرمایا

اقبال: "اس کی برداشت بھی دشواری ہے۔"

میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

"تیرا احسان بہت بھاری ہے۔"

مولوی میر حسن صاحب مرحوم کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے ایک دفعہ یہ بھی بتایا۔ کہ انہیں اپنی چھوٹی بہن سے بے حد محبت تھی۔ اتفاق سے ایک مرتبہ وہ ایسی بیمار ہوئی۔ کہ جانبر ہونے کی توقع نہ رہی۔ مولوی صاحب ہر دم کمسن بچی کے پاس بیٹھے ہوئے اسے ڈھارس بندھاتے رہتے۔ فوت ہونے سے چند گھنٹے قبل بچی نے حسرت سے کہا: "اب تو آپ ہر وقت میرے پاس رہتے ہیں لیکن مرنے کے بعد میں آپ سے کیسے ملوں گی؟" مولوی صاحب نے فوراً ہی آبدیدہ ہو کر وعدہ کیا۔ کہ "پریشان نہ ہو۔ میں تم سے روزانہ ملا کروں گا۔" بچی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور مولوی صاحب نے اسی دن سے معمول بنا لیا کہ صبح ہی گھر سے قبرستان کو چل دیتے۔ اور بہن کی قبر پر پہنچنے تک قرآن کریم کی ایک منزل ختم کر لیتے ——— ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے۔ کہ مولوی صاحب تمام زندگی اس قاعدہ پر عمل پیرا رہے۔ اور عالمِ ضعیفی میں بھی بدستور ان کا یہی معمول رہا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات وہ اس معمول کو باقی رکھنے کے لئے ضروری کاموں اور سفر کو بھی ملتوی کر دیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب مجھ پر جس قدر شفقت فرماتے تھے۔ اس سے زیادہ میری والدہ محترمہ کا خیال رکھتے تھے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کے مہربان دوست فقیر سید افتخار الدین مرحوم کی صاحبزادی تھیں۔ اس پُرانے اور مخلصانہ رشتۂ مودت نے ہمیں ایک دوسرے کے اتنا قریب کر دیا تھا۔ کہ جب میرے حقیقی بھائی فقیر سید فصیح الدین کی شادی کا مسئلہ پیش ہوا۔ تو والد ماجد نے ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کیا۔ انہوں نے خواجہ حسن نظامی کو خط لکھا اور خواجہ صاحب نے دہلی کے قریب فرید آباد میں اپنے ایک دوست کے ہاں ان کا رشتہ کرا دیا۔

دوستی کے بارے میں ڈاکٹر صاحب اس قدر وضعدار اور مستقل مزاج تھے کہ جس شخص یا خاندان سے ایک بار قلبی تعلق قائم کیا۔ اُسے زندگی کے آخری لمحہ تک استوار رکھا۔ ان کے دوست فقیر سید افتخار الدین مرحوم کا ذکر اس کتاب میں آچکا ہے اُن کے انتقال کے ۲۲ سال بعد جب اُن کے فرزند فقیر سید سراج الدین نے پی۔ سی۔ ایس میں منتخب ہو کر ملازمت کا آغاز کیا۔ تو ڈاکٹر صاحب نے انہیں ایک خط لکھا جس کا عکس یہاں پیش کیا جا رہا ہے؛ ان کی بزرگانہ شفقت، نصیحت اور دعا اس خط کی نمایاں خصوصیت ہے!

[illegible]

عزیزم سلمہ — تمہارا خط پڑھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ ملازمت میں تم اپنے والد مرحوم کے نقش قدم پر چلو گے۔ اور اپنے فرائض منصبی دیانت سے ادا کرو گے۔ محنت اور دیانت ہی ترقی کا راز [illegible] ہے۔ زیادہ دعا

محمد اقبال

ڈاکٹر صاحب مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے۔ کہ ان سے میری خط و کتابت بہت کم ہوئی ہے۔ حالانکہ ان کی عادت تھی کہ خط نہایت باقاعدگی سے لکھتے تھے۔ اور باقاعدگی سے خطوں کا جواب دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے کبھی ان کے نام خط لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ انہوں نے لاہور سے بہت کم قدم باہر نکالا۔ میری زندگی کا زیادہ حصہ بھی لاہور ہی میں گزرا۔ اس لئے خط و کتابت کی نوبت ہی نہ آئی۔ آج پرانے کاغذات کو اُلٹ پلٹ کے دیکھ رہا تھا۔ تو ان کا ایک خط نظر آیا۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں بمبئی جا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہؤا۔ تو مجھے بلا کے کہا کہ رفیق غزنوی نے میری چند غزلیں ہز ماسٹرز وائس پر ریکارڈ کرائی ہیں۔ ان سے مل کے ذرا یہ معلوم کرنا۔ کہ وہ کونسی غزلیں ہیں۔ میں نے بمبئی پہنچ کے اس سلسلے میں معلومات حاصل کیں۔ اور ڈاکٹر صاحب کو خط لکھا۔ غالباً میں نے جو معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ وہ نامکمل تھیں اس لئے انہوں نے مجھے ذیل کا خط لکھا۔

ڈیر وحید ۔ آپ کا خط [illegible]

معلوم [illegible] غزل یا غزلیں [illegible]

رفیق [illegible]

[illegible]۔ محمد اقبال

[illegible]

۱۹۳۰ء میں جب والد محترم کا انتقال ہؤا۔ تو ڈاکٹر صاحب کو یہ خبر سن کے سخت صدمہ ہؤا۔ لیکن وہ اس زمانے میں خود بیمار تھے۔ اس لئے نماز جنازہ میں شریک ہونے کے لئے نہ پہنچ سکے۔ البتہ اس واقعہ سے کئی دنوں کے بعد شام کے وقت علی بخش کے ساتھ ہمارے ہاں تشریف لائے۔ اس وقت میں گھر پر موجود تھا۔ ڈاکٹر صاحب بہت مضمحل اور ناتواں سے معلوم ہو رہے تھے گلے کی تکلیف بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ آواز بیٹھی ہوئی تھی اور مشکل سے سنائی دیتی تھی۔ وہ زیادہ دیر باتیں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک جملہ کہتے اور پھر رک جاتے اس زمانے میں ان کی بینائی بھی قریب قریب جاتی رہی تھی۔ ہمارے ہاں وہ دیر تک بیٹھے رہے لیکن تعزیت کے چند جملے کہنے کے بعد انہیں چُپ سی لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ اُفق کے پار زرنگار بادلوں کی سرحد سے پرے اپنی منزل کا نشان تلاش کر رہے ہیں۔ والدہ کی والدہ کے انتقال کے بعد ان کی صحت برابر گرتی چلی گئی تھی۔ اس حالت میں اپنے عزیز دوست کی موت کا حادثہ ان کے لئے بڑا صدمہ جانکاہ تھا۔ وہ دیر تک یونہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔ لیکن اُن کے چہرہ سے ذہنی کرب کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔

حرفے زلبش شنیدہ ام من

حکیم الامت علامہ اقبال پر اگرچہ استغراق و محویت کی ایسی کیفیت بھی طاری ہوتی تھی کہ وہ پہروں چُپ چاپ بیٹھے رہتے تھے۔ لیکن احباب کی صحبت میں جب سکوت کا یہ بند ٹوٹ جاتا تھا۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خیالات کا سمندر اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ ایسے موقعوں پر کبھی موضوع کو لے کے وہ گھنٹوں مسلسل اس پر گفتگو کرتے چلے جاتے تھے۔ ایک ہی موضوع کے موافق اور مخالف دلائل دیتے۔ ان کا تجزیہ کرتے اور ایسے ایسے حکیمانہ نکتے پیدا کرتے۔ کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے لیکن ان کی گفتگو خشک اور بے کیف نہیں ہوتی تھی۔ قدرت نے انہیں خداداد ذہانت علم و فضل کے ساتھ ساتھ بذلہ سنجی اور ظرافت کی نعمت بھی عطا فرمائی تھی۔ اس لئے وہ خشک سے خشک بحث کو لطیفوں چُست فقروں اور چٹکلوں سے بڑا پُر لطف بنا دیتے تھے مجھے یقین ہے کہ اگر کسی طرح ان کی گفتگو محفوظ کر لی جاتی تو ہر صحبت کی رُوداد ایک اچھی خاصی کتاب کی صورت اختیار کر لیتی۔ کبھی کبھی وہ باتیں کرتے کرتے جوش میں آ کے کہہ جاتے تھے کہ میں اس موضوع پر پوری کتاب لکھ سکتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اس وقت تک زیرِ بحث موضوع کے متعلق انہوں نے جو کچھ کہا تھا۔ وہ خاصی بڑی کتاب کا مضمون تھا۔ میں اکثر سوچتا ہوں۔ کہ اگر کوئی شخص ان محفلوں کی پوری رُوداد قلم بند کرتا جاتا۔ تو آج ڈاکٹر صاحب کے ملفوظات کی سینکڑوں جلدیں ہمارے پاس موجود ہوتیں مجھے خود اس بات کی توفیق نہیں ہوئی کہ کبھی کاغذ

پنسل لے کے ان کے پاس بیٹھ جاتا۔ اور وہ جو کچھ فرماتے اُسے قلم بند کر لیتا۔ اس لئے ذہن میں جو واقعات محفوظ رہ گئے ہیں۔ اُنہیں بیان کئے دیتا ہوں۔

ایک عقیدت مند

میرے ایک دوست شریف احمد ریلوے میں ملازم تھے۔ انہیں حکیم الامت سے اس قدر عقیدت تھی۔ کہ انہوں نے مرحوم کے کلام کا بیشتر حصہ حفظ کر لیا تھا۔ اور ہمیشہ اس کا ورد کرتے رہتے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے دریافت کیا۔ تم ڈاکٹر صاحب کے کلام پر اتنے فریفتہ ہو۔ لیکن کبھی اُن سے ملے بھی ہو۔ انہوں نے جواب دیا۔ مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع تو نہیں ملا البتہ اشتیاق ضرور ہے۔ میں شریف احمد کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے گیا۔ اور ان کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ "قبلہ جس طرح میکالے نے کہا ہے کہ اگر ملٹن کی نظم PARADISE LOST کے تمام نسخے نیست و نابود ہو جائیں تو میں حافظہ کی مدد سے اسے لکھوا سکتا ہوں۔ اسی طرح میرا یہ دوست آپ کے کلام کا حافظ اور اس لحاظ سے دوسرا میکالے ہے۔ یہ سن کے ان کے چہرے پر جو علالت کی وجہ سے مضمحل ہو رہا تھا مسرت کی لہر دوڑ گئی اور آنکھوں میں ایک تیز سی چمک پیدا ہو گئی۔ اس واقعے سے چند ہفتوں کے بعد ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ شریف احمد کو اب تک اس بات پر بڑا فخر ہے کہ اُسے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے گفتگو کرنے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔

وطن کی بہنیں

اخبار وطن کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خان ڈاکٹر صاحب کے ہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ ان دنوں ڈاکٹر صاحب انار کلی میں رہتے تھے۔ انار کلی میں کشمیری طوائفیں بھی رہتی تھیں۔ میونسپلٹی نے ان کے لئے دوسری جگہ تجویز کی۔ چنانچہ انہیں وہاں سے اٹھوا دیا گیا۔ اس زمانے میں مولوی انشاء اللہ خان کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے ملنے گئے۔ لیکن ہر مرتبہ یہی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے ایک دن جو گئے تو ڈاکٹر صاحب گھر پر موجود تھے۔ مولوی صاحب نے کہا ڈاکٹر صاحب جب سے طوائفیں انار کلی سے اٹھوا دی گئی ہیں۔ آپ کا دل بھی یہاں نہیں لگتا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ مولوی صاحب آخر وہ بھی تو "وطن کی بہنیں" ہیں۔

تہذیب کا پیمانہ

ایک دفعہ تہذیب و تمدن کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک شخص نے کہا۔ تہذیب بتدریج بڑی نمایاں ترقی کر رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ذرا مجھے بھی تو بتایئے۔ کہ آپ نے تہذیب کو کس پیمانے سے ناپ کے یہ معلوم کیا ہے کہ وہ برابر ترقی کرتی جا رہی ہے۔ اگر آپ کے پاس تہذیب کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں۔ تو آپ کو ماننا پڑیگا۔ کہ دورِ حاضر میں تہذیب رُو بہ تنزل ہے۔

بس کی بات نہیں

علی بخش ڈاکٹر صاحب کا پرانا ملازم ہے۔ وہ ۱۹۰۰ء میں ان کے ہاں نوکر ہوا۔ اس کی شادی بچپن ہی میں ہو گئی۔ بیوی تھوڑے عرصہ کے بعد انتقال کر گئی۔ چنانچہ اس نے دوسری شادی نہ کی۔ اور اپنی ساری عمر ڈاکٹر صاحب کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ ہیں اکثر اس کی وفاداری کا ذکر ڈاکٹر صاحب سے کیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے کہا قبلہ! علی بخش سالہا سال سے آپ کی خدمت کر رہا ہے کبھی اس کے متعلق بھی ایک آدھ شعر ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے "یہ میرے بس کی بات نہیں۔ شعر آ گیا۔ تو لکھوا دوں گا۔"

شاعر کی آنکھیں

ایک دفعہ میں نے زمانہ کی قدر ناشناسی کا ذکر کیا اور کہا کہ لوگ اپنے ملک کے بڑے بڑے شاعروں۔ قومی رہنماؤں اور عظیم المرتبت انسانوں کی زندگی میں ان کی قدر نہیں کرتے۔ ڈاکٹر صاحب اس سوال سے بہت متاثر ہوئے۔ اور کسی قدر تامل کے بعد فرمایا۔ تم غور کرو تو معلوم ہو گا کہ جب شاعر کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔ تو دنیا کی بند ہوتی ہیں۔ اور جب شاعر کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی ہیں۔ تو دنیا کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اور وہ صدیوں تک اس کی تعریف و توصیف کے گیت گاتی رہتی ہے۔

عورت کی ذمہ داری

ایک مرتبہ کہنے لگے۔ کہ جس قوم نے عورتوں کو ضرورت سے زیادہ آزادی دی۔ وہ کبھی نہ کبھی ضرور اپنی غلطی پر پشیمان ہوئی ہے۔ عورت پر قدرت نے اتنی اہم ذمہ داریاں عاید کر رکھی ہیں۔ کہ اگر وہ ان سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے۔ تو اُسے کسی دُوسرے کام کی فرصت ہی نہیں مل سکتی۔ اگر اسے اس کے اصلی فرائض سے ہٹا کے ایسے کاموں پر لگایا جائے جنہیں مرد انجام دے سکتا ہے۔ تو یہ طریق کار یقیناً غلط ہو گا۔ مثلاً عورت کو جس کا اصل کام آئندہ نسل کی تربیت ہے" ٹائپسٹ یا کلرک بنا دینا نہ صرف قانونِ فطرت کی خلاف ورزی ہے۔ بلکہ انسانی معاشرہ کو درہم و برہم کرنے کی افسوس ناک کوشش ہے۔

بغاوت

میں نے ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔ کیا یہ صحیح ہے کہ انسان بغاوت کا دوسرا نام ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ بالکل صحیح۔ آخر تم ہی کہو۔ تم نے اپنے والدین کے احکام کی تعمیل کہاں تک کی ہے۔ کیا تم میں سرکشی کی رُوح نہیں۔ تم اپنے آپ کو بار بار بغاوت پر آمادہ نہیں پاتے۔ میں نے شرمندہ ہو کے نگاہیں جھکا لیں۔

شاعر کا شکریہ

ڈاکٹر صاحب گلے کی تکلیف میں مبتلا ہوئے۔ تو حکیم عبدالوہاب عرف حکیم نابینا سے

رجوع کیا۔ حکیم صاحب نے بڑی توجہ سے علاج کیا۔ لیکن خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ ایک مرتبہ حکیم صاحب کے علاج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ حکیم نابینا صاحب جن دنوں میرا علاج کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ کہ اگر میں اچھا ہو گیا۔ تو شکر گزاری کے طور پر ایسے اشعار لکھوں گا۔ جن کی نظیر شاعری میں مشکل ہی سے مل سکے گی۔

لیکن حکیم صاحب کا علاج بھی بے سود ثابت ہوا۔ اور یہ اشعار لکھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

محرومی

گلے کی تکلیف شروع ہوتے ہی ڈاکٹر صاحب کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ اس حادثہ نے ان کی رہی سہی مصروفیتیں بھی ختم کر دیں۔ اور انہوں نے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ اس زمانے میں انہیں ترکی اور مصر سے تقریر کرنے کی دعوتیں آئیں۔ ان دعوت ناموں کا ذکر آتا تھا۔ تو کہتے تھے۔ کہ میرا گلا ٹھیک ہو ہوئے تو ضرور جاؤں گا۔ لیکن مرض بڑھتا گیا اور ڈاکٹر صاحب صحت کی جانب سے مایوس ہو گئے۔ ایک دن بڑی مایوسی کے لہجہ میں فرمایا۔ خدا نے مجھے زبان تو عطا کی ہے۔ لیکن آواز سے محروم کر دیا۔ یہ کہتے کہتے ان پر رقت طاری ہو گئی۔

شکوۂ ہند

ایک مرتبہ میں نے مسدس حالی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ آپ کے شکوہ سے پہلے مولینا حالی نے بھی تو شکوہ لکھا ہے۔ کہنے لگے ہاں مسدس حالی کو بھی شکوہ ہی کہنا چاہیئے لیکن وہ صرف

شکوہ سنج تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار

ڈاکٹر صاحب نے ایک بزرگ کا واقعہ سنایا۔ کہ اُن سے کسی شخص نے یہ سوال کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کس طرح ہو سکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ پہلے اسوۂ حسنہ پر عمل کو اپنا شعار بناؤ اور زندگی اس میں ڈھالو پھر اپنے آپ کو دیکھو: یہی اُن کا دیدار ہے:

مطالعہ

امیل لڈوگ نے نپولین بونا پارٹ کے متعلق ایک بہت اچھی کتاب لکھی ہے۔ میں نے کتاب پڑھی۔ تو اس میں یہ واقعہ پڑھ کے بڑی حیرت ہوئی کہ نپولین کا نوکر ہر دن بہت اس کے مطالعہ کے لئے روز صبح کو بہت سی کتابیں جیل میں لے آتا تھا۔ اور شام کو وہ سب واپس لے جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے اس واقعہ کا ذکر آیا۔ تو میں نے کہا حیرت ہے کہ نپولین دن بھر میں اتنی کتابیں کیسے پڑھ لیتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں میں خود تھوڑے سے وقت میں بہت سی کتابیں پڑھ ڈالتا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب انسان کا مطالعہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ تو وہ بہت سی باتوں کو جو بار بار دُہرائی جاتی ہیں اور جنہیں بار بار پڑھنا غیر ضروری ہے نظر انداز کرتا چلا جاتا ہے اور صرف وہی حصے پڑھتا ہے جن میں کوئی نئی بات بیان کی گئی ہو۔ پھر کہنے لگے ایسی کتاب تو کہیں صدیوں میں لکھی جاتی ہے۔ جو شروع سے آخیر تک اس طرح بالاستیعاب پڑھنے کے لائق ہو کہ اس کا

ایک لفظ بھی چھوٹنے نہ پائے۔

عتاب

زندگی بھر میں ڈاکٹر صاحب مجھ سے صرف ایک مرتبہ ناراض ہوئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کی عقیدت عشق کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام زبان پر آتا تھا۔ تو ان کی آنکھیں پُرنم ہو جاتی تھیں۔ ایک روز میں نے جرأت کر کے پوچھا: "آپ نے کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بھی کی ہے"؟ یہ سنتے ہی مارے غصہ کے ان کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اور ابرو پر بل پڑ گئے۔ پھر کہنے لگے: "ایسے سوال نہیں کیا کرتے"۔

سامانِ دوئی ہمہ سوختم

میرے خاندان کے لوگوں میں سے ڈاکٹر صاحب کے تعلقات سب سے پہلے میرے نانا فقیر سید افتخار الدین مرحوم کے ساتھ استوار ہوئے۔ وہ اپنے ہم عصروں میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بعض ایسے جلسوں کی صدارت بھی کی تھی۔ جن میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی بعض مشہور نظمیں پڑھی تھیں۔ فقیر سید افتخار الدین اور مرزا سلطان احمد میں بڑی گہری دوستی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی بھی ان دونوں سے بے تکلفی تھی۔ خان بہادر شیخ فیض محمد مرحوم (سپیکر پنجاب اسمبلی) نے ان تینوں حضرات کی دوستی اور رفاقت کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ ایک مرتبہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس کی دو نشستوں میں ایک کی صدارت

فقیر سید افتخار الدین نے کی اور دوسری کی مرزا سلطان احمد نے پہلی نشست مغرب کی نماز سے پہلے ختم ہو گئی۔ اور دوسری مغرب کی نماز کے بعد شروع ہوئی پہلی نشست میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی مشہور نظم "شمع و شاعر" پڑھی تھی۔ جو ان کی اردو نظموں میں خاص درجہ اور مقام رکھتی ہے۔ یہ نشست ختم ہونے کے بعد سب لوگ جلسہ گاہ سے نکلے۔ تو مرزا سلطان احمد نے ڈاکٹر صاحب سے کہا "تم بھی عجب ہرجائی ہو۔ کبھی میری بغل میں اور کبھی فقیر افتخار الدین کی بغل میں"۔ ڈاکٹر صاحب نے اس فقرہ کے جواب میں ذیل کے اشعار فی البدیہہ ارشاد فرمائے۔

ہم نشینِ بے ریائم از رہِ اخلاص گفت
اے کلامِ تو فروغِ دیدۂ برنا و پیر
درمیانِ انجمن معشوقِ ہرجائی مباش
گاہ با سلطان باشی گاہ باشی با فقیر
گفتمش اے ہم نشیں معذور می دارم ترا
در طلسمِ امتیازِ ظاہری ہستی اسیر
من کہ شمعِ عشق را در بزمِ جاں افروختم
سوختم خود را و سامانِ دوئی ہم سوختم

(یہ اشعار پہلی بار اس کتاب میں شائع کئے گئے ہیں)

یہ تو آدمی ہیں

میرے ایک قریبی رشتہ دار سید واجد علی کو کتے پالنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دفعہ میں

ان کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کے ڈاکٹر صاحب سے ملنے گیا۔ موٹر میں ان کے کتے بھی تھے۔ ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کے پاس جا بیٹھے۔ اور کتوں کو موٹر ہی میں چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب کی ننھی بچی منیرہ بھاگتی ہوئی آئی۔ اور کہنے لگی "ابا جان موٹر میں کتے آئے ہیں"۔

ڈاکٹر صاحب نے ہماری طرف اشارہ کرکے کہا۔ "نہیں بیٹا یہ تو آدمی ہیں"۔

خوش فہمی

لوگوں میں مشہور ہے کہ جو شخص حج کرلے۔ اس کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک مرتبہ پوچھا "کیا یہ صحیح ہے کہ حج کرنے سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ "نہیں یہ تو بالکل غلط ہے"۔

میں نے عرض کیا۔ "تو حج کی غرض و غایت کیا ہے"۔

جواب ملا "یہی خدا کا حکم ہے"۔

بعد میں جب حج کی ضرورت و اہمیت میرے ذہن نشین ہوئی تو مجھے سخت تاسف ہوا کہ میں نے ڈاکٹر صاحب سے اس قسم کا سوال ہی کیوں کیا تھا۔

اندیشۂ مرگ

گلے کی تکلیف میں ایک ڈاکٹر علامہ اقبال کو دیکھنے آیا۔ اس نے چند دوائیں تجویز کیں۔ پھر کہنے لگا۔ اس مرض میں پرہیز ضروری ہے۔ فلاں فلاں چیزوں سے پرہیز کیجیے۔ علامہ نے پوچھا "لیکن اگر میں آپ کی ہدایات پر عمل نہ کروں تو"۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "تو خدانخواستہ

آپ کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ حکیم الامت کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب کیا انسان کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا ہے۔ جو موت کے خطرے سے خالی ہے۔

ڈاکٹر یہ سُن کے حیران رہ گیا اور پھر کہنے لگا۔ آپ کی سی طبیعت کا مریض میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

لارڈ کچنر

لارڈ کچنر جو ایک زمانے میں ہند کا کمانڈر انچیف بھی رہ چکا تھا۔ بڑے مشہور برطانوی جرنیلوں میں سے تھا۔ پہلی عالمگیر جنگ کے زمانے میں وہ مفقود الخبر ہوا۔ تو جس طرح آج ہٹلر کے متعلق کہا جا رہا ہے۔ کہ وہ زندہ ہے۔ اور دنیا کے سامنے آنے کے لئے مناسب موقع کا منتظر ہے۔ اسی طرح کچنر کے متعلق بھی یہ افسانہ تراش لیا گیا کہ وہ ڈوبا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ علامہ اقبال ایک روز والد بزرگوار سے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک خوش فکر بزرگوار نے کہا۔ سنا ہے کچنر زندہ ہو گیا ہے۔

علامہ مرحوم نے جواب دیا۔ ہاں ممکن ہے۔ "کاڈ لیور آئل"[1] کی صورت میں آ گیا ہو۔

ایک جلسہ

پہلی جنگِ عظیم کے ختم ہونے سے کچھ عرصہ پہلے سر مائیکل اوڈوائر لیفٹیننٹ گورنر پنجاب

---

[1] COD LIVER OIL

نے جنگ کے سلسلہ میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ یہ جلسہ بریڈلا ہال میں ہوا۔ کثرت سے لوگ موجود تھے۔ چند حضرات تقریریں کر چکے تو ڈاکٹر صاحب شعر پڑھنے تشریف لائے۔ وہ سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ جوان کی گوری چِٹی رنگت پر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ انہوں نے نہایت خوش الحانی کے ساتھ فارسی کے چند اشعار پڑھے۔ ان میں سے ایک شعر یاد رہ گیا ہے ؎

ملک و تدبیر و تجارت را بانگلستاں سپرد
جرمنی را چشم حیران و دل بے تاب داد

علامہ مرحوم نے یہ شعر ختم کئے تو لوگوں نے شور مچایا! اردو۔ اردو۔ ڈاکٹر صاحب نے کسی قدر توقف کے بعد اسی دلکش ترنم کے ساتھ اپنی وہ مشہور نظم پڑھی جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

خدائے حُسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا

---

[1] لیکن شیخ اعجاز احمد جو بریڈلا ہال کے اس جلسہ میں موجود تھے، فرماتے ہیں، کہ ڈاکٹر صاحب نے فارسی نظم تو نہیں پڑھی تھی، البتہ اردو کی وہ مشہور نظم پڑھی تھی جس کے پہلے دو اشعار یہ ہیں:۔

صبح جب مری نگہ سودائی نظارہ تھی
آسماں پر اک شعاعِ آفتاب آوارہ تھی
میں نے پوچھا اس کرن سے اے سراپا اضطراب
تیری جانِ ناشکیبا میں ہے کیسا اضطراب

احساسِ غرور

ایک دفعہ راجہ نریندر ناتھ نے ڈاکٹر صاحب کو چائے پر مدعو کیا۔ راجہ صاحب کے کمرے میں ہرن کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب ان سے بچ بچ کے گزرے۔ راجہ نریندر ناتھ نے حیران ہو کر وجہ پوچھی آپ نے جواب میں بتایا کہ میرے استادِ محترم نے ایک مرتبہ میری دی ہوئی جائے نماز استعمال نہ کرنے کا سبب بتاتے ہوئے انکشاف کیا تھا۔ کہ ہرن کی کھال پہ بیٹھنے یا چلنے سے انسان کے دل میں لاشعوری طور پر غرور کا احساس پیدا ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی مسلمہ بات ہے جس کا ذکر حدیث شریف میں بھی موجود ہے۔ راجہ نریندر ناتھ اس جواب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ کئی منٹ تک وہ خاموش کھڑے ڈاکٹر صاحب کے چہرے کو تکتے رہے۔



نقشِ ثانی

اعجازِ بیانی

ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کی زندگی جس قدر سادہ، تکلفات سے ناآشنا اور ان کے افکار و خیالات جس طرح سلجھے ہوئے تھے، اسی طرح عام ملاقاتوں میں ان کا اندازِ گفتگو بھی سلیس و سادہ ہوتا تھا۔ وہ نہ تو مقفیٰ الفاظ استعمال فرماتے اور نہ مسجع تراکیب اور استعاروں سے بول چال کو پُر تکلف اور بوجھل بناتے۔ سادہ اردو، ٹھیٹ پنجابی لہجہ میں بے تکلفی کا انداز، ہاں، کبھی کبھی انگریزی الفاظ و مصطلحات کے استعمال سے ان کی عام ملاقاتیں اور خاص محفلیں بڑی دلچسپ علمی اور بعض اوقات ہنگامہ پرور بن جاتیں۔ کوئی اجنبی ڈاکٹر صاحب کی محفل میں پہلے پہل شریک ہو کر شاید یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ شخص فلسفہ و منطق کا امام ہے جس نے معارف و افکار کی زلفِ برہم کو سلجھایا ہے، علم و فن کے چہرے کو آب و رنگ بخشا ہے اور جس نے شاعری کو نئے الفاظ اور جدید ترکیبیں عطا کی ہیں، وہ روزمرہ کی زندگی اور عام گفتگو میں اتنا سادہ ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے اندازِ شعر گوئی کا ایک اور نمایاں پہلو ہے جو میرے علم میں ہے، یہ بھی بظاہر دوسرے واقعات کی طرح ایک واقعہ ہے مگر ایسا واقعہ جو ڈاکٹر صاحب کی اعجاز بیانی، واردات قلبی اور کیفیت شعر گوئی کا آئینہ دار ہے۔ یہ دیکھنے میں صرف ایک جھلک ہے مگر اس میں ڈاکٹر صاحب کی رعنائی خیال کی کتنی ہی تجلیاں ضو فگن ہیں — ! میرے

دوست ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم بہت زمانہ سے علامہ موصوف کی خاص صحبتوں میں شریک ہوتے تھے انہوں نے اپنی کوشش سے مجلہ "کارواں" جاری کیا جس کی ملک کے طول و عرض میں خاصی دھوم تھی۔ ایک دن وہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر تھے، ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر انہوں نے موقعہ پا کر ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ ان کے اس نوطلوع جریدہ کے لئے کوئی تازہ غزل یا نظم مرحمت فرمائی جائے: اس درخواست کے بعد تاثیر مرحوم ڈاکٹر صاحب سے متواتر تقاضا کرتے رہے، مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ مزاج ہی نہ تھا کہ کسی نے فرمائش کی اور انہوں نے جھٹ سے غزل یا نظم کہہ دی دوسرے شاعروں کی طرح داد و تحسین حاصل کرنے کے لئے شعر کہنا تو اُن کی طبیعت کو کسی طرح پسند کیا گوارا بھی نہ تھا۔ ہاں: تو اس واقعہ کے کئی مہینہ بعد ڈاکٹر تاثیر مرحوم علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اپنی تازہ ترین غزل اصلاح و نظر ثانی کے لئے پیش کی۔ ڈاکٹر صاحب بڑے انہماک سے یہ غزل سن رہے تھے، جب تاثیر مرحوم اس شعر پر پہنچے۔ ؎

زُلف آوارہ، گریباں چاک او مستِ شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

تو ڈاکٹر صاحب چونک پڑے، انہوں نے اس شعر کو کئی بار پڑھوایا، پھر فرمانے لگے شاعر نے اپنی غلط فہمی کا تو اظہار کر دیا ہے، مگر اس سے کہیں بڑی اور سنگین غلطی کی نشان دہی باقی رہ گئی ہے ذرا کاغذ پنسل تو لو، اور لکھو۔۔۔! ؎

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

کہہ گئیں رازِ محبت پردہ داریہائے شوق
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں
تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

(یہ اشعار ڈاکٹر صاحب کے دوسرے اردو مجموعہ کلام "بالِ جبریل" میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکے ہیں)

ڈاکٹر صاحب اس قدر روانی، تیزی اور ارتجال و برجستگی کے ساتھ اشعار موزوں

کرتے جارہے تھے کہ خود تاثیر مرحوم کے قول کے مطابق وہ پہلا شعر بمشکل لکھ پاتے تھے، کہ ڈاکٹر صاحب دوسرا شعر پڑھ دیتے یوں سمجھئے کہ شعر و سخن کا فوارہ سچ مچ اُبل رہا تھا اور قوتِ تحریر قوتِ گویائی کے آگے اپنی کمزوری اور درماندگی کا زبانِ حال سے اعتراف کر رہی تھی۔

شاید یہی وہ کمالِ فن تھا جس کی بناء پر میرے ایک سوال کے جواب میں شاعرِ مشرق نے خود فرمایا تھا۔ کہ اشعار کے لئے مجھے موزوں الفاظ کی جستجو کرنا نہیں پڑتی، بلکہ پورے کے پورے اشعار وارداتِ قلبی اور فکر کے سانچے میں ڈھل کر خود بخود سامنے آجاتے ہیں: گویا۔

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

قوم کی جنس

ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم نے کسی زندہ اور صاحب کردار قوم کی پہچان بتاتے ہوئے ایک بار کہا کہ جس طرح دُنیا کی دوسری اشیاء میں نر اور مادہ کا جنسی امتیاز موجود ہے۔ اسی طرح قومیں بھی نر اور مادہ ہوتی ہیں، اور اس کا پتہ ان کے قول و عمل، معاشرت، کردار، خصائل اور نفسیات سے چلتا ہے۔

("جگر ہو خوں تو چشم و دل میں ہوتی ہے نظر پیدا")

وعدہ کا پاس

سیّد واجد علی کے چھوٹے بھائی سیّد افضال علی شاہ کی شادی کی تقریب لاہور میں انجام پا رہی تھی۔ آخر عمر میں ڈاکٹر صاحب میں جو کسل مندی اور ہنگاموں سے گریز کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا اس کا ایک سبب ان کی مسلسل علالت بھی تھا، اسی لئے وہ شادی کی تقریب میں شریک نہ ہو سکے تمام اعزا اور بزرگوں نے جن میں میرے والد فقیر سیّد نجم الدین مرحوم سیّد مراتب علی مرحوم میجر مبارک علی شاہ، سیّد محمد عبد اللہ (مولوی میر حسن صاحب کے پوتے) سیّد امجد علی سیّد واجد علی اور نواب مشتاق احمد گرمانی بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی عدم شرکت کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ اب بحث چل پڑی کہ ڈاکٹر صاحب کو کس طرح یہاں لایا جائے، ہر کوئی اپنی اپنی رائے دے رہا تھا آخر کار میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی، اور وعدہ کیا کہ اللہ تعالے نے چاہا تو ڈاکٹر صاحب کو میں اس تقریب میں ضرور لے آؤں گا، چنانچہ میں موٹر میں بیٹھ کر ڈاکٹر صاحب کے میکلوڈ روڈ والے مکان کی جانب روانہ ہو گیا، وہاں پہنچا تو مرحوم اپنے کمرے میں بنیان اور دھوتی پہنے لیٹے ہوئے تھے اور حقّہ پی رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بزرگانہ محبت و شفقت کے لہجہ میں بولے۔ کیوں بھئی! کیسے آنا ہوا؟ میں نے عرض کیا، سیّد افضال شاہ کی شادی کی تقریب میں آپکے نہ آنے کا سب کو ملال ہے میں اُن سب کو منتظر چھوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ اور یہ وعدہ کر کے آیا ہوں۔ کہ ڈاکٹر صاحب کو میں اپنے ہمراہ ضرور لاؤں گا۔

ڈاکٹر صاحب نے قدرے توقف فرمایا، میرے چہرے کا یہ عالم کہ ایک رنگ آتا

تھا اور ایک رنگ جاتا تھا کہ نہ جانے ڈاکٹر صاحب کیا جواب دیتے ہیں، چند سے تامل کے بعد انہوں نے فرمایا "وعدہ کا پاس کرنا ضروری ہے۔ چلو میں چلتا ہوں" یہ کہہ کر انہوں نے لباس تبدیل کیا، اور میرے ہمراہ شادی کی تقریب میں تشریف لے آئے۔ میری خوشی کا کیا پوچھنا، میرے اندر فتحمندی اور کامیابی کا جذبہ اُبھر آیا تھا سب سے بڑھ کر اس کا احساس تھا کہ ڈاکٹر صاحب قبلہ سے جو خاکسار کو حُسنِ ظن اور اُن کی ذات پر ناز اور اعتماد ہے اُس کی لاج رہ گئی۔

ڈیوس روڈ کی اس کوٹھی میں علامہ اقبال دو گھنٹے ٹھہرے۔ احباب و اعزا کے درمیان بڑی دلچسپ گفتگو اور ہنسی خوشی کی باتیں رہیں، اس واقعہ کی یاد جب بھی آتی ہے تو مسرت کے ساتھ ساتھ ندامت کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ محض اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے میں ڈاکٹر صاحب کے آرام اور معمولات میں کس قدر مخل ہوا —— ہاں؛ اس صحبت کی ایک بات تو رہی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور دوسرے مہمان بزرگ جس کمرے میں تشریف فرما تھے اُس میں ریچھ کی کھال پڑی ہوئی تھی، سیّد واجد علی شاہ نے جگہ کو کشادہ کرنے کیلئے اُسے کمرے کے ایک خالی کونے میں اُٹھا کر پھینک دیا، ڈاکٹر صاحب نے یہ دیکھ کر فرمایا۔

"پہلے اُسے جان سے مارا، پھر اسے ذلیل کرنے کے درپے ہو۔"

مظلوم

بعض ایسے لوگ بھی مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں، جو نہ عربی زبان و ادب میں خاطر خواہ استعداد رکھتے ہیں؛ نہ عربِ قدیم کے علمی سرمایہ پر ان کی نگاہ ہے نہ قرآن کریم کو ٹھیک

طور پر سمجھ سکتے ہیں مگر اپنی اس علمی تہی مائیگی کے باوجود قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کی کوشش فرماتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کو اس قسم کی باتوں سے بڑی اذیت ہوتی تھی۔ وہ اپنی متانت و سنجیدگی اور عالی ظرفی کے باوجود اس غم کو چھپا نہ سکے ایک بار فرما ہی دیا —— قرآن کریم اس اعتبار سے بڑا ہی مظلوم صحیفہ ہے کہ جسے دنیا میں اور کوئی کام نہیں ملتا، وہ اس کے ترجمہ و تفسیر میں مصروف ہو جاتا ہے —— حالانکہ یہ نہایت ہی نازک اور محتاط ذمہ داری ہے۔

سُلطان ٹیپو

ایک بڑے انگریز افسر نے اپنے کتے کا نام ٹیپو رکھ لیا تھا وہ ہمیشہ اسی نام سے کتے کو پکارتا تھا۔ یہ حرکت اس نے دانستہ کی تھی کہ اس طرح مسلمانوں کے ایک نامور فرد کی تحقیر ہوتی تھی یہ بات ڈاکٹر صاحب کے کانوں تک بھی پہنچی، ایک بار انہوں نے نہایت تاسف کے لہجہ میں شکوہ کیا کہ انگریز قوم ہمارے مجاہد کا مضحکہ اڑاتا ہی ہے، سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ خود مسلمان بھی اس حرکت کے مرتکب ہوتے ہیں —— میں اس وقت ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں موجود تھا، اور اُن کے یہ الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں، کہ ٹیپو سلطان کی عظمت کو تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی، وہ مذہب، ملت اور آزادی کے لئے آخر دم تک جنگ کرتا رہا یہاں تک کہ اسی نیک مقصد کی راہ میں شہید ہو گیا۔

درمیانِ کارزارِ کفر و دیں
ترکشِ ما را خدنگِ آخریں

مذہب و سیاست

اسلام میں "مذہب و سیاست" کی کیا حیثیت ہے، یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ان کی واحد حیثیت ہے یا جداگانہ؟ یہ سوال میں نے ڈاکٹر صاحب سے بطورِ خاص کیا۔ کیونکہ ان دنوں بعض مغرب زدہ طبقوں کی جانب سے یہ شوشہ چھوڑا گیا تھا بلکہ باقاعدہ ایک تحریک چل رہی تھی کو سیاست اور مذہب دونوں کا جدا جدا معاملہ ہے، ان کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے اس استفسار پر ایک لمحہ کے لئے بھی توقف نہیں فرمایا۔ جیسے وہ اس مسئلہ پر بہت کچھ غور و خوض کر چکے ہیں، اور ان کا فیصلہ ایک سوچنے اور سمجھنے والے دماغ کا فیصلہ ہے انہوں نے دو ٹوک انداز میں ــــ کہا ــــ "ایک" اپنے جواب کو اور زیادہ مثبت اور محکم بنانے کے لئے انہوں نے ساتھ ہی انگشتِ شہادت بھی اٹھا دی، یہ منظر میری نگاہ کے سامنے آج تک اس طرح تازہ ہے جیسے یہ امر روز فردا کی بات ہے، ڈاکٹر صاحب کی زبانِ حقیقت ترجمان سے نکلا ہوا لفظ "ایک" اب تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے اور ان کی انگشتِ شہادت کا اٹھنا اب بھی میری نگاہوں میں پھر رہا ہے۔

پیغمبروں کا خاصہ

ڈاکٹر صاحب مرحوم راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے۔ تو راقم الحروف کے ایک عزیز ڈاکٹر رحمت اللہ قریشی کے زیر علاج رہنے کا اتفاق ہوا قریشی صاحب نے اپنی سعادت اور خوش بختی سمجھ کر ڈاکٹر صاحب کے ہمدرد معالج کے فریضہ کو انجام دیا اپنے امکان

کی حد تک خدمت و تواضع میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ــــ کچھ عرصے بعد میرے ایک عزیز سید امجد علی (جن کا مفصل تعارف آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے) ولایت گئے تو قریشی صاحب نے ان کی واپسی پر پیغام دیا کہ ڈاکٹر صاحب سے میرا اسلام کہیے اور عرض کیجیے کہ اگر ماں اولاد پیدا کرے تو اقبال جیسی ــــ ورنہ ہم جیسے لوگوں کے دنیا میں آنے سے کیا فائدہ؟

سید امجد علی لاہور پہنچے۔ تو ایک روز مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کے لئے لندن کا ایک پیغام ہے، چلو وہ ان کو پہنچا آئیں، چنانچہ راقم الحروف اور سید امجد علی ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر پہنچے اور قریشی صاحب نے جو پیغام دیا تھا وہ جوں کا توں انہیں کے الفاظ میں پہنچا دیا۔

ڈاکٹر صاحب اس پر مسکرائے، اور فرمایا: "نہیں قریشی میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ وہ مہمان نواز ہے۔ جو پیغمبروں کا خاصہ ہے!"

پتھر

ایک بار محفل میں اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے ان کارناموں کا ذکر چل پڑا۔ جن سے مسلمانوں کی غیر معمولی شجاعت، بے جگری اور بے مثال سرفروشی کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں!

ڈاکٹر صاحب نے اس گفتگو میں حصہ لیا وہ بولے:۔

مسلمان ایک ایسا پتھر ہے کہ جس پر گرتا ہے اُسے پاش پاش کرتا ہے اور جو اس پر گرتا ہے پاش پاش ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے مردِ مومن کی اس شان کو "اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ" کے انداز میں پیش فرمایا ہے۔ جس کی ترجمانی علامہ اقبال نے ان لفظوں میں کی ہے۔

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

مگر

مردِ مومن کی دوسری شان "رحماء بینھم" بھی ہے :۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

رونق

ڈاکٹر صاحب کے متین و سنجیدہ چہرے پر جیسی رونق میں نے ایک بار دیکھی، پھر اس انداز کی رونق کبھی نہیں دیکھی؛ ہوا یہ کہ میں ایک دن ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ حسبِ معمول بستر پر نیم دراز حالت میں آرام فرما تھے، میں نے سلام کیا، بڑی شفقت کے ساتھ سلام کا جواب دیا، میں قریب بیٹھ گیا، اور موقع محل دیکھ کر گفتگو کے دوران میں نے عرض کیا کہ ایک صاحب سے آپ کی شاعری پر گفتگو ہو رہی تھی، میں نے ان سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کے افکار و تخیل کا کیا کہنا! کئی مقامات پر تو انہوں نے ہزاروں سال کی تاریخ کو صرف ایک مصرعہ میں بیان کر دیا ہے، اسے کہتے ہیں دریا کو کوزے میں بند کر دینا۔ اس کے بعد میں نے مثال کے طور پر آپ کا یہ مصرعہ پڑھا۔

ع خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر

میں نے اس مصرعہ کا مفہوم اپنے مخاطب پر یوں واضح کیا کہ انسان صرف محسوس کی جانے والی اور نظر آنے والی چیزوں کی پرستش کا عادی ہو چکا تھا ـــــ ظاہر ہے کہ انسان کی ہزاروں سال کی تاریخ اُس کی اس کم نظری اور غلط اندیشی سے عبارت ہے

کہ وہ دنیا کے مختلف حصّوں میں، مختلف انداز کی محسوس کی جانے اور نظر آنے والی توّتوں کو اپنا معبود و مسجود سمجھتا اور بناتا رہا۔ یہاں تک کہ اسلام نے اُسے خدائے واحد و حقیقی کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور یہیں سے انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ روشن دور شروع ہو جاتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب نے میرے معروضات کو بڑی توجہ سے سنا اور میری بات ختم ہونے تک اُن کے چہرے پر ایسی رونق پھیل گئی، جو میرے لئے بالکل انوکھی تھی؛ میں یہ جان کر خوش تھا کہ ڈاکٹر صاحب میری اس شعر فہمی کو حوصلہ افزائی کا مستحق قرار دے رہے ہیں۔

ابنِ خلدون

راقم الحروف کے والد فقیر سیّد نجم الدین مرحوم نے ایک روز ڈاکٹر صاحب کے ہاں میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــــ اسے تاریخی کتابوں کے مطالعہ کا بہت شوق ہے، میں نے مشورہ دیا ہے کہ "ابنِ خلدون" ضرور پڑھے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا، پوری کتاب نہیں، صرف "مقدّمہ"!!

آج اُن کے اس جواب پر غور کرتا ہوں، تو حیرت و عبرت کے کتنے ہی اوراق نگاہوں کے سامنے کھلتے چلے جاتے ہیں؛ ابنِ خلدون کا مقدّمہ واقعی خود ایک مستقل کتاب ہے

"مُیموں کا سایہ"

میرے محترم دوست علی بہادر حبیب اللہ کے والد شیخ محمد حبیب اللہ سیدن پور ضلع بارہ بنکی یو۔پی کے معروف و مشہور تعلقہ دار تھے اور اودھ کے دوسرے تعلقہ داروں کی طرح زیادہ تر لکھنؤ میں رہا کرتے تھے؛ اُن دنوں بچّوں کو ولایت بھیج کر تعلیم حاصل کرانا بڑے فخر کی بات سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ علی بہادر بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ عالم کم سنی میں لندن بھیج دیئے گئے؛ آٹھ سال کی عمر میں لندن جانا، اور پورے پندرہ سال بعد وہاں سے وطن واپسی اُس زمانے میں یقیناً بڑی غیر معمولی بات تھی؛ پھر علی بہادر حبیب اللہ نے تو ہندوستان آتے ہی بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ سیاسیات میں حصّہ لینا شروع کر دیا چنانچہ جب ۱۹۳۶ء میں وہ مسلم لیگ کے کارکن کی حیثیت سے لاہور آئے۔ اور ڈاکٹر اقبال سے ——— بطور خاص ملاقات کی:

تو ڈاکٹر صاحب نے اُن سے دریافت کیا۔

"کیوں بھئی! ولایت ہو آئے"

اس کے جواب میں وہ فخریہ انداز میں بولے۔

"جی ہاں! میں تو آٹھ سال کی عمر ہی میں، انگلینڈ چلا گیا تھا"

اس جواب کو سُن کر ڈاکٹر صاحب کی رگِ ظرافت پھڑکی، اُن سے نہ رہا گیا مسکرا کر کہا۔

"پھر تو آپ کو یُوں کہنا چاہیے۔ ؎

"میموں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں"

علی بہادر حبیب اللہ ڈاکٹر صاحب کی اس بذلہ سنجی پر لاجواب ہو کر رہ گئے!

آخری ملاقات

۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر صاحب اللہ کو پیارے ہوئے، ان کے انتقال سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے کہ اُن کا پرانا نوکر اور باوفا خادم علی بخش، سیّد واجد علی کے پاس آیا، اور ڈاکٹر صاحب کا یہ پیغام پہنچایا کہ انہوں نے آپ کو یاد فرمایا ہے، آپ ابھی چل کر اُن سے مل لیں، سیّد واجد علی اُسی وقت ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کی طرف چل پڑے، جب وہ وہاں پہنچے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب مُصلّا بچھائے بارگاہ خداوندی میں سجدہ ریز ہیں، اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ سیّد واجد علی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ وہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ اس لئے وہ ایک عجیب حیرانی کے عالم میں ڈاکٹر صاحب سے ذرا دُور ہٹ کر بیٹھے رہے اور جب آدھ گھنٹہ گزر چکا اور ڈاکٹر صاحب کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تو انہوں نے علی بخش سے اشارہ سے پوچھا علی بخش اُن کا منشا سمجھ گیا، وہ بولا کہ اس وقت آپ واپس چلے جائیں تو اچھا ہے' یہ وقت مخل ہونے کا نہیں ہے، سیّد واجد علی اپنے گھر لوٹ آئے، لاہور سے پھر انہیں اپنے تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں باہر جانا پڑا اور کاموں اور مصروفیتوں نے اتنا طُول کھینچا کہ ایک مہینہ کے بعد لاہور کو واپس ہوئے مگر شاعرِ مشرق اور حکیم الاُمّت اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ وہ داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سیّد واجد علی سے نہ جانے کیا کہنا چاہتے تھے۔ کس کام کے لئے انہیں بلوایا تھا، یہ بات "راز" ہی بن کر رہ گئی۔

چالیس سال

پیسہ اخبار اپنی قدامت کے سبب اُردو صحافت کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا، اس کے ایڈیٹر اور مالک مولوی محبوب عالم کی صاحبزادی فاطمہ بیگم سماجی کاموں میں بڑی سرگرمی کے ساتھ حصہ لیتی تھیں، ان کی مخلصانہ جدوجہد کی بدولت لاہور میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے کئی ادارے قائم ہو چکے تھے؛ یہ کام اُس زمانے میں آسان نہیں تھا۔ قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آتی تھیں مسلمانوں کا معاشرہ لڑکیوں کی تعلیم کو برداشت کرتے ہوئے ناگواری محسوس کرتا تھا فاطمہ بیگم کو اس جدوجہد میں لوگوں کے طعنے گوارا کرنے پڑتے وہ گاہ بہ گاہ ڈاکٹر صاحب کے پاس مشورہ کے لئے آتیں۔ ڈاکٹر صاحب اُن کی ہمت بندھاتے اور ایسی پُراُمید باتیں کرتے کہ فاطمہ بیگم کے اندر حوصلہ پیدا ہوتا، اور ان کی دل شکستگی، مایوسی میں تبدیل نہ ہونے پاتی۔

ایک بار فاطمہ بیگم آئیں تو اپنی مشکلات کا حال سنایا۔ "میرے راستے میں اس طرح روڑے اٹکائے جاتے ہیں، میں کیا کروں؛ اور سب سے زیادہ دُکھ تو اس بات کا ہے کہ میں مسلمان لڑکیوں میں مذہبی تعلیم کا وہ شغف نہیں پاتی۔ جو اُن میں فطری طور پر ہونا چاہئے تھا۔"

ڈاکٹر صاحب نے فاطمہ بیگم سے کہا آپ مایوس اور دل برداشتہ نہ ہوں اس مذہب کی خوبیاں چالیس سال کی عمر کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہیں، تمہارا کام تو زمین ہموار کرنا اور اس میں پودا لگانا ہے، یہ پودا ایک دن خود بخود تناور درخت بن جائے گا اور پھل لائے گا۔

تحفہ درویش

افغانستان میں بچہ سقہ نے امیر امان اللہ خاں کے خلاف جب بغاوت کر دی، اور ملک کے حالات انتہائی ابتر ہو گئے، تو نادر شاہ جو اُس وقت فرانس میں مقیم تھے، اس بغاوت کو فرو کرنے کی نیت سے روانہ ہوئے اور افغانستان جاتے ہوئے، جب لاہور سے گزرے، تو علامہ اقبال اُن سے ملنے کے لئے ریلوے اسٹیشن پہنچے؛ ڈاکٹر صاحب مردِ درویش تھے، روپیہ اُن کے پاس کبھی جمع ہی نہیں ہوا، خرچ آمدنی سے کچھ زیادہ ہی رہتا، وہ تنگی ترشی سے گزر کر کے بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے؛ مالی مشکلات میں بھی ان کے تیور ملول نہیں ہوئے اور ان کی جبینِ قناعت پر شکن نہیں دیکھی گئی۔

ڈاکٹر صاحب کے پاس اس وقت کئی سو روپوں کی ساری پونجی تھی، جسے وہ لے کر نادر شاہ سے ملے، اور کہا۔

"آپ جس نیک مقصد کے لئے جا رہے ہیں، اس کے لئے روپے کی بھی شدید ضرورت ہو گی، اس لئے میرا ہدیہ قبول فرمائیے"۔

نادر شاہ، ڈاکٹر صاحب کے مالی حالات سے واقف تھے، اس لئے وہ اس پیشکش پر حیران رہ گئے!

یہ بات آج تک راز بنی ہوئی ہے کہ شاہ نادر خاں نے ڈاکٹر صاحب کا یہ نذرانہ قبول کیا یا واپس کر دیا! عام خیال و تاثر یہ ہے کہ انہوں نے یہ رقم لینی مناسب نہ سمجھی ہو گی!

اہل سخاوت اور اربابِ کرم سے تاریخ کا کوئی دَور خالی نہیں رہا، بادشاہوں، نوابوں اور راجاؤں کی سخاوت اور داد و دہش کے بہت سے افسانے زبان زدِ خاص و عام ہیں اور تاریخ کے صفحات پر مرقوم بھی ہیں ـــــ مگر اقبالؔ کی قلندری اور دریا دلی اِس شان وسعت میں بھی سب سے نرالی ہے!

نبیِ کامل

خواجہ کمال الدین کی انگریزی کتاب :-

THE IDEAL PROPHET

کا ترجمہ اُردو میں ہونے لگا، تو یہ سوال سامنے آیا کہ اردو میں کتاب کے نام کا ترجمہ کیا ہونا چاہئے۔ مختلف اصحاب نے اپنی سمجھ اور ذوق کے مطابق مختلف نام بتائے، مگر ان میں سے کوئی نام بھی اصل کتاب کے مفہوم کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا تھا، ڈاکٹر صاحب کے سامنے یہ مسئلہ آیا تو انہوں نے برجستہ فرمایا۔

"نبیِ کامل"

خوشِ فہمی

ایامِ جوانی میں ذہن و فکر پر کیا کیا عالم گزرے ہیں، اور طبیعت کی جولانی نے کیسے کیسے گُل کھلائے ہیں۔ اب اس کا خیال آتا ہے تو بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ کوئی نئی کتاب علم میں آتی، تو اُسے پڑھنے کے بعد یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی کہ ہم بھی کچھ ہیں اور ہمارا

مطالعہ بھی، پھر کوشش یہ رہتی کہ جو کچھ پڑھا ہے اُسے دوسروں کے سامنے مختلف پیرایوں میں بیان بھی کیا جائے، اس کا مقصد اپنے علم و مطالعہ کے مظاہرے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ آج اپنی سادہ دلی پر ندامت ہوتی ہے۔

اُنہیں دنوں کا واقعہ ہے کہ والدِ مرحوم کی لائبریری سے مشہور یورپی مصنّف لین پول کی کتاب[1]

STUDIES IN A MOSQUE.

BY STANLEY LANEPOOLE.

لے کر پڑھی اس کتاب میں حضور سرورِ کائنات کا حُلیہ مبارک تفصیل کے ساتھ لکھا ہوا تھا میرے مطالعہ میں یہ بالکل نیا اضافہ تھا۔ اس لئے جب میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو خیال آیا کہ ڈاکٹر صاحب عاشقِ رسولؐ ہیں اور حضورؐ کے ذکر سے ان کی طبیعت بے حد متاثر ہوتی ہے بہتر ہے اس کتاب کا اُن سے ذکر کر دوں، چنانچہ دورانِ گفتگو جب بھی ذرا وقفہ آیا، میں نے فوراً عرض کیا ـــ

"ڈاکٹر صاحب میں نے سرورِ کائنات کا حُلیہ پڑھا ہے"

ڈاکٹر صاحب نے فوراً جواب میں ارشاد فرمایا۔

"ہاں: وہ تو عام کتابوں میں لکھا ہوا ملتا ہے"

ڈاکٹر صاحب کا یہ جواب میرے لئے غیر متوقع تھا، میں تو یہ سمجھے ہوا تھا کہ میرے مطالعہ میں ایک ایسی چیز آئی ہے جس سے عام لوگ کیا شاید خواص بھی بے خبر ہوتے ہیں۔

---

[1] PUBLISHED BY EDEN REMINGTON & CO
LONDON & SYDNEY, 1893
PAGE 38

تھوڑے سے وقفہ کے بعد میں نے پھر جسارت کی اور عرض کیا ــــــ

"حضور کے حلیۂ مبارک کی تفصیل میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضور کی پیشانی کے درمیان ایک ایسی رگ گزرتی تھی۔ جو نمایاں طور پر جنبش کرتی نظر آتی، بیعن پول نے انگریزی میں اس کیفیت کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے کہ " PASSION " کے وقت حضور کی یہ شریان نمایاں طور پر پھڑکتی تھی"۔

میں نے یہ عرض کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ " PASSION. " کا اردو ترجمہ کیا ہو سکتا ہے؟

فرمایا، "جوش"

حُسنِ انتخاب

ڈاکٹر صاحب اپنی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں قیام فرما تھے، اُس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کی قیام گاہ پر ایک نئے ملاقاتی آئے، اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اتنے میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک سوال کر دیا، کہنے لگے ــــــ

"آپ نے مذہب، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ اور فلسفہ وغیرہ علوم پر جو کتابیں اب تک پڑھی ہیں، اُن میں سب سے زیادہ بلند پایہ اور حکیمانہ کتاب آپ کی نظر سے کون سی گزری ہے"؟

ڈاکٹر صاحب اس سوال کے جواب میں کُرسی سے اُٹھے اور نووارد ملاقاتی کی

طرف ہاتھ کا اشارہ کیا کہ تم ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں، یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے دو تین منٹ میں واپس آئے تو اُن کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی، اُس کتاب کو انھوں نے اس شخص کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے فرمایا

"قرآنِ کریم"

نصیحت

ایک بار کالج کے چند طلبا ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمیں کچھ نصیحت کیجئے تاکہ اُس کی روشنی میں اپنی زندگی کو سنوار سکیں۔

یہ زمانہ ڈاکٹر صاحب کی علالت کا تھا بیحد کمزور ہو گئے تھے زیادہ وقت آرام کرنے اور لیٹے رہنے میں گزرتا، اُس وقت تک اُن کی کئی کتابیں شائع ہو چکی تھیں طلبا کے جواب میں بس اتنا فرمایا۔

"اب تک جو کچھ میں کہہ چکا ہوں" پہلے اُس پر عمل کیجئے"

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بڑی سچّی اور قیمتی بات فرمائی، لوگوں کا آج کل یہ فیشن ہو گیا ہے کہ بڑے آدمیوں سے "تازہ" پیغام" مانگتے ہیں، اور اس سے پہلے دیئے ہوئے "پیغاموں" پر عمل نہیں کرتے، بے عمل قوم عمل کی بجائے لفظوں سے کھیلتی ہے۔

اُردو اور فارسی

ڈاکٹر صاحب ضیق النفس میں مبتلا تھے، جب افاقہ کی کوئی صورت نظر نہ آتی، تو

طبیعت میں اضمحلال پیدا ہو جاتا، اور خاموش رہنے میں شاید انہیں سکون ملتا، ایک دن پلنگ پر آرام فرما تھے کہ اتنے میں ایک غیر ملکی سیاح ملاقات کے لئے آیا، اس کے دل میں نہ جانے کیا کیا تمنائیں ہوں گی کہ ڈاکٹر صاحب سے فلاں مسئلہ پر تبادلہ خیال کروں گا، یہ بات ان سے پوچھوں گا، اُس مسئلہ پر اُن کی رائے معلوم کروں گا، مگر ڈاکٹر صاحب کی کم گوئی اور نحیف آواز کو دیکھ کر، وہ ان سے سوالات کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ پھر بھی اُس نے ایک سوال کر ہی ڈالا ——— یہ کہ آپ نے اُردو چھوڑ کر، فارسی میں شاعری کیوں شروع کی؟

ڈاکٹر صاحب کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ خود ہی بول پڑا۔

"غالباً اس لئے کہ اُردو زبان آپ کے وسیع خیالات کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔"

ڈاکٹر صاحب نے زبان سے تو کچھ نہ کہا، صرف اپنا سر ہلا دیا، جو اس بات کی علامت تھا کہ کہنے والے نے ٹھیک بات کہی!

سیاح نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب آرام فرمانا چاہتے ہیں۔ باتیں کرنا نہیں چاہتے، چنانچہ وہ اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔

عاشقِ رسُولؐ

ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کی سیرت اور زندگی کا سب سے زیادہ ممتاز، محبوب اور قابلِ قدر وصف جذبۂ عشقِ رسولؐ ہے۔ ذاتِ رسالت مآب کے ساتھ اُنہیں جو والہانہ عقیدت تھی اُس کا اظہار اُن کی چشمِ نمناک اور دیدۂ تر سے ہوتا تھا کہ جہاں کسی نے حضورؐ کا نام اُن کے سامنے لیا، اُن پر جذبات کی شدت اور رقت طاری ہو گئی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں

ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام آتے ہی اور اُن کا ذکر چھڑتے ہی اقبال بے قابو ہو جاتے۔

کفارِ مکہ نے انسانیت کے اس محسنِ اعظم کو کس کس طرح ستایا اور کیسے کیسے ظلم و ستم ڈھائے، طائف میں حضورؐ کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا، غرض حضورؐ کی مظلومیت اور پریشان حالی کا کوئی واقعہ بھی ڈاکٹر صاحب کے سامنے بیان کیا جاتا۔ تو اُن کے احباب نے بارہا دیکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب چیخیں مار مار کر رو رہے ہیں، اور نڈھال ہوتے جا رہے ہیں۔

عشقِ رسولؐ ڈاکٹر اقبال کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا اور ان کے ذہن و فکر پر چھا گیا تھا، وہ کتنے بڑے فلسفی تھے اور فلسفہ کا سارا معاملہ عقل کے بل بوتے پر چلتا ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو وہ عقل کی کسوٹی پر جانچنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ اس معاملہ میں وہ ایمان بالغیب کے قائل تھے۔ بس جو حضورؐ نے فرما دیا وہ دین و ایمان اور سر آنکھوں پر۔ اس بارگاہ میں چون و چرا کی گنجائش ہی نہیں، سمعنا و اطعنا اطاعت فرمانبرداری اور غلامی، یہی ایمان کی دلیل بلکہ بنیاد ہے ؎

بہ مصطفٰےؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اقبال کی شاعری کا خلاصہ، جوہر اور لُبِ لباب عشقِ رسولؐ اور اطاعتِ رسولؐ ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی صحبتوں میں عشقِ رسولؐ کے جو مناظر دیکھے ہیں، اُن کا لفظوں میں پوری طرح اظہار بہت مشکل ہے وہ کیفیتیں بس محسوس کرنے کی تھیں، جب یہ مقدس ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو جی چاہتا ہے کہ ایک واقعہ بیان کر ہی دوں۔

ایک دن سیرت نبوی پر گفتگو ہو رہی تھی، ڈاکٹر صاحب نے خاص انداز میں ایک واقعہ سنایا ـــــ فرمانے لگے

ایک معرکہ میں مسلمان سپہ سالار کا گھوڑا زخمی ہو گیا، زخموں کی یہ حالت تھی کہ گھوڑے کا میدانِ کارزار میں کھڑا رہنا دشوار تھا، وہ بیٹھنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف کفار یلغار کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے، اس عالم میں امیرالعسکر نے گھوڑے کو مخاطب کر کے کہا :-

اگر تم نے اس نازک وقت میں میرا ساتھ چھوڑ دیا، تو اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے کے بعد رسول اللہ سے تمہاری شکایت کروں گا۔

یہ واقعہ بیان کر کے ڈاکٹر صاحب زار و قطار رونے لگے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس واقعہ سے سپہ سالار کے عشقِ رسول کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

جنّت میں داخلہ

اسپین کی تاریخ کے مُصنّف احمد المقری [1] نے ایک یہودی پیغام بر کے متعلق یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ جب وہ ایک پُرشکوہ محل کے انتہائی دلکش اور جاذبِ نظر حصّوں سے گذرتا ہوا اپنے آقا کا پیغام لے کر خلیفہ المستنصر کے وزیر باتدبیر کی خدمت میں پہنچا تو گرد و پیش کے ماحول سے اس قدر مرعوب اور سحرزدہ ہو چکا تھا۔ کہ مسلمان وزیر نے

[1] THE HISTORY OF THE MOHAMMUDAN DYNASTIES IN SPAIN By AHMED IBN MOHAMMAD-AL-MAKKRI. VOL. 1, PAGE 160

یہودی قاصد سے اس کا سبب پوچھ ہی لیا، یہودی قاصد جو محل کے صدر دروازہ پر ایک مہیب صورت دربان کے پاس سے گذر کر آیا تھا، گویا ہوا کہ اس شاندار محل میں جو خوبصورت باغات اور حسین نظارے موجود ہیں۔ ان کی بنا پر میں اسے بہشت سے تعبیر کرتا، اگر دروازے پر مہیب صورت دربان کی بجائے رضوان ہوتا۔

وزیر نے یہودی ملاقاتی کا یہ تبصرہ خلیفہ المستنصر تک پہنچایا۔ تو خلیفہ نے برجستہ جواب دیا۔ کہ :-

"اگر دروازہ پر رضوان ہوتا تو اسے بہشت میں کب داخل ہونے دیتا" میں نے ایک دن ڈاکٹر صاحب کو المقری کی تاریخ سپین میں پڑھا ہوا یہ واقعہ سنایا۔ تو بہت محظوظ ہوئے، اور جب تک میں اس واقعہ کو سُناتا رہا لُطف لیتے رہے۔ اپنی بات ختم کر چکا تو انہوں نے فرمایا :-

"المقری نے اسپین کی شاہکار تاریخ مرتب کرنے میں جو زبردست محنت اور کاوش کی ہے مسلمانوں کو اُسے کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے"

شیخ عطا محمدؒ

شیخ اعجاز احمد کے والد شیخ عطا محمد ڈاکٹر صاحب کے حقیقی برادرِ اکبر تھے، اور عمر میں اپنے بھائی محمد اقبال سے ۱۷، ۱۸ سال بڑے۔ شیخ عطا محمد صاحب نے جو اُس زمانے میں محکمہ انجینئرنگ پنجاب میں افسر تھے اپنے والد بزرگوار کی زندگی میں ہی اپنے بھائی محمد اقبال کو اولاد کی طرح پرورش کرنے کی ذمّہ داری سنبھال لی تھی۔ بعد کے واقعات سے ظاہر ہے کہ انہوں نے

اپنے بھائی کی تعلیم و تربیت کے لئے جس جذبہ ایثار و محبت کا ثبوت دیا، اُس کی مثال آج کی قرابتوں اور مراسم برادرانہ میں مشکل سے ہی مل سکتی ہے۔ شیخ عطا محمد کی کوشش کے نتیجہ میں ہی وہ ملک کی اعلےٰ تعلیمی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد مزید حصول علم کے لئے یورپ گئے اپنے چھوٹے بھائی محمد اقبال کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کی انہیں اتنی فکر تھی جیسے اقبال کو اقبال بنانا ہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اور نصب العین تھا۔

علامہ مرحوم کو بھی اپنے بڑے بھائی کی بے پناہ شفقت اور محبت کا شدید احساس تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شیخ عطا محمد کے فرزند عزیز شیخ اعجاز احمد کو بھتیجے کی بجائے ہمیشہ اپنا فرزند ہی سمجھا۔ ان کی پرورش تعلیم، تربیت اور ملازمت غرضیکہ ہر مرحلہ اور ہر دور میں ڈاکٹر صاحب کا مشورہ شامل رہا۔ وہ ذرا بھی کبیدہ خاطر ہوتے تو ڈاکٹر صاحب اُن کے لئے شفقت اور محبت کا پیغام بن جاتے؛ اور ان کے مسائل کو حل کرنے میں مصروف ہو جاتے؛ حتّٰی کہ زندگی کے ہر موڑ پر ان کی راہنمائی اور دستگیری کے لئے تیار رہتے۔

شیخ اعجاز احمد اپنے چچا کی اس محبت اور شفقت کا تصور کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ حسین خوابوں اور یادوں کے جزیرہ میں گم ہو گئے ہیں؛ انہیں اعتراف ہے کہ ان کی زندگی کی تمام کامیابیوں میں ڈاکٹر صاحب کے قیمتی مشوروں کا تاثر ضرور شامل رہا ہے۔

شیخ عطا محمد نے اپنے چھوٹے بھائی محمد اقبال کے لئے کس انداز میں سوچا، اور کیا کچھ کیا؛ اس نکتہ پر سوچتے سوچتے چند لمحوں کے لئے ذہن ساکت ہو کر رہ جاتا ہے؛ اور ایک سوال خود بخود اُبھر آتا ہے کہ شیخ عطا محمد کی اس سعی پیہم، اور انتھک جد و جہد کو ڈاکٹر صاحب کی موجودہ عظمت، شہرت اور مقبولیت میں کون سا نمایاں مقام دیا جائے ———— ؟

جس کی بدولت یہ غنچہ پھول بن کر مہکا، ستارہ بن کر چمکا؛ اور اُفقِ علم و دانش پر آفتاب درخشاں بن کر جگمگایا ———— !

اقبال کے بھائی

ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد اور میرے والد فقیر سید نجم الدین صرف سرکاری ملازمتوں سے وابستگی کے باعث واقف و آشنا نہیں تھے، بلکہ حُسن مذاق اور طبائع کی ہم آہنگی کے باعث ان کے درمیان اس حد تک بے تکلفی تھی جسے اُس زمانے کے شرفاء کی مجلسی زندگی کی جان سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دونوں احباب کسی محفلِ سماع میں شریک ہوئے۔ شہر کی ایک مغنیہ "اقبال" نامی رونقِ محفل تھی۔ بس والد صاحب نے اس حُسنِ اتفاق سے فائدہ اٹھایا اور شیخ عطا محمد کا تعارف کراتے ہوئے ازراہِ تفنن کہہ دیا۔ کہ "یہ اقبال کے بھائی ہیں ————"

شیخ صاحب لاجواب ہو کر مُسکرا دیئے، اور اِدھر محفل کشتِ زعفران بن گئی، یہ لطیفہ کافی دنوں تک احباب کے لئے ظرافت کی آماجگاہ بنا رہا۔ شیخ عطا محمد ڈاکٹر محمد اقبال کے حقیقی بھائی تو تھے ہی، اس لئے ہر بار مُسکرا کر چپ ہو رہتے۔

ذوقِ موسیقی

پنجاب ہائی کورٹ کے جسٹس آغا حیدر نے ایک بار ڈاکٹر صاحب سے تذکرہ کیا کہ مجھے فقیر سید نجم الدین کے بارے میں پتہ لگا ہے وہ طاؤس نہایت عمدہ بجاتے ہیں اور اس

فن میں بڑی مہارت رکھتے ہیں کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کے یہاں انہیں سنا جائے، ڈاکٹر صاحب بارہا ہمارے گھر کی محفلوں میں والد صاحب مرحوم سے طاؤس سن چکے تھے، انہوں نے جسٹس آغا حیدر سے کہا کہ وہ بیشک طاؤس خوب بجاتے ہیں مگر فقیر نجم الدین شائق موسیقار ہیں، وہ صرف اپنے گھر پر اپنا شوق پورا کر لیتے ہیں اور اُن کے اس شوق کی بدولت دوستوں کا دل بھی بہل جاتا ہے، میں نے کبھی یہ بات نہیں سنی کہ انہوں نے کسی دوسرے کے یہاں جا کر طاؤس بجایا ہو۔ مگر میرے اُن سے جو دوستانہ مراسم ہیں، اُن کے اعتماد کی بنا پر مجھے توقع ہے کہ وہ میری بات ٹالیں گے نہیں۔

چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے والد صاحب سے فرمائش کی، تو انہیں تعمیل کرتے ہی بنی! ایک دن مقرر ہوا، والد صاحب ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچے وہ گذشتہ تیس سال سے طاؤس بجانے کی مشق کر رہے تھے، اور اس فن میں اُنہیں خاصی شہرت حاصل تھی انہوں نے بہت دیر تک طاؤس بجایا۔ درباری، مالکوس، اور دامن اُن کے پسندیدہ راگ تھے، جسٹس آغا حیدر اور ڈاکٹر صاحب اس نغمہ سرائی سے بہت محظوظ ہوئے، اور یہ محفل رات گئے کیف کے عالم میں برخواست ہوئی۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب خود بھی ستار نوازی کے شائق تھے اور اُن کے ستار بجانے کی مضراب ڈاکٹر جاوید اقبال کے پاس کافی دنوں محفوظ رہی!

ووٹ اور طوائف

جب "مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات" کا نفاذ عمل میں آیا اور متحدہ

ہندوستان میں صوبائی کونسلوں اور مرکزی اسمبلی کے "عام انتخابات" کے لئے کام شروع ہوا تو ملک کے سیاسی حلقوں میں تلاطم برپا ہو گیا۔ انڈین نیشنل کانگریس نے ان انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا، اور اس چیز نے صورتِ حال کو اور زیادہ پیچیدہ اور ہنگامہ خیز بنا دیا۔ ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کی ایک بڑی تعداد اس کا فیصلہ ہی نہ کر سکی کہ انتخابات میں حصّہ لیا جائے، یا نہ لیا جائے، بس ایک تذبذب کا عالم تھا۔

ایک طرف سیاسی مفکرین تھے کہ ابھی سوچ بچار ہی کر رہے تھے دوسری طرف انتخابی تیاریوں کا وہ زور شور کہ پورے ملک میں ہر طرف پُر شور بگولے سے اُٹھ رہے تھے۔ ووٹ حاصل کرنے کے لئے دعوتوں، جلسوں اور پارٹیوں کے ہنگامے شروع ہو چکے تھے، کہیں جلسے، کہیں چائے کی دعوتیں، کسی جگہ کوئی اور دلچسپ پروگرام: ووٹروں کو پھانسنے کے لئے دامِ ہم رنگ زمیں بچھائے جا رہے تھے، ہندوستان کے لئے سیاست و جمہوریت کی دنیا کا یہ پہلا تجربہ تھا، وہ جو کسی کا قول ہے کہ ہر نئی چیز لذیذ ہوتی ہے —— تو اس لذت نے بھی انتخابات کی سرگرمیوں میں بڑی دلچسپی پیدا کر دی تھی۔

اسی زمانہ میں کسی شوخ طبع اور من چلے کو جو شوخی سوجھی، تو اُس نے ایک مصرع موزوں کر دیا ؎

ووٹ حاضر ہے اگر چائے کی پیالی مل جائے

یہ مصرعہ آناً فاناً لاہور میں زبان زدِ خاص و عام ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب کے سامنے بھی کسی نے ازرہِ تفنّن یہ مصرعہ دہرا دیا، ڈاکٹر صاحب نے اس مصرعہ کو سنتے ہی برجستہ فرمایا۔ ؎

چُلبلی، شوخ طرحدار، نرالی مل جائے

نوجواں مرتے ہیں جس پر وہی بالی مل جائے

یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور کے رؤسا خصوصاً نوجوانوں میں شہر کی مشہور مغنیہ اقبال بیگم عرف "بالی" کی بڑی دھوم تھی، ڈاکٹر صاحب نے کس شوخی اور ندرت کے ساتھ اس نام (بالی) کو منظوم کیا اور "حصولِ ووٹ" کو حصولِ طوائف کے برابر سمجھا، ان کے اس اندازِ بیان میں اُس وقت کے معاشرہ پر کس قدر بھرپور طنز ہے

صُوبائی اسمبلی کی رُکنیت

ڈاکٹر صاحب کوئی شک نہیں قابلِ اعتماد سیاسی فراست رکھتے تھے، مگر وہ عملی طور پر سیاسی ہنگاموں اور خاص طور سے الیکشن کے بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتے تھے اُن کی فطرت کو توڑ جوڑ سے کوئی مناسبت نہ تھی، بلکہ ایسی باتوں سے بلند تر تھے۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے انتخابات کا آغاز ہوا، تو ڈاکٹر صاحب کے احباب و رفقا نے شدید اصرار کیا کہ آپ اس انتخاب میں امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیں، ڈاکٹر صاحب نے عذر کیا، احباب کی اس تجویز اور آزمائش کو ٹالنا چاہا، مگر یہ اصرار اور تقاضا اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ ڈاکٹر صاحب بالآخر رضا مند ہو گئے، وہ جس حلقۂ انتخاب سے کھڑے ہوئے تھے ابتدا میں مقابلہ پر کئی امیدوار تھے، لیکن آخر میں صرف ملک محمد دین ان کے حریف رہ گئے، اس حلقہ میں اُن کی برادری کا خاصہ زور اور اثر تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی شہرت مقبولیت ہردلعزیزی، قابلیت اور شخصیت کی وہ گرد کو بھی نہ پہنچ سکتے تھے۔

ایک طرف کرایہ کے کارکن تھے اور دوسری طرف جاں باز عقیدت مند اور بے غرض مداحین، ہم ان دنوں بازار حکیماں والے مکان میں رہتے تھے، راقم الحروف کی نگاہوں میں اُن جلوسوں کا سماں آج تک پھر رہا ہے، جو ڈاکٹر صاحب کی تائید و موافقت میں شہر کی سڑکوں اور گلیوں سے گزرتے تھے، وہ پُرجوش تقریریں، وہ اخلاص سے لبریز نعرے، کسی کسی چلتے ہوئے فقرے اور چُبھتے ہوئے جملہ میں ڈاکٹر صاحب کے حریف پر طنز بھی ــــ اس قسم کی شوخیاں اور خوش فعلیاں تو انتخابات کا خاصہ بھی ہیں: بعض من چلے کارکنوں نے کچھ اشعار بھی موزوں کر لئے تھے، جو پُرجوش انداز میں گائے جاتے تھے، مثلاً[1]

اساں کسے نوں کچھ نئیں کہنا ساڈی محمد داری اے

گو بھی وچ بھی پے گیا کیڑا ہور بھی جو نزکاری اے

یہ اشعار لاہور میں زبان زد خاص و عام تھے، اور گھر گھر میں ان کی گونج سنائی دیتی تھی۔ فریق مخالف کو ڈاکٹر صاحب کی شہرت اور مقبولیت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ اس لئے اس نے الیکشن جیتنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور انتخابات میں کامیاب ہونے کے لئے جو تدبیریں بھی اختیار کی جا سکتی ہیں، اُن کو بروئے کار لایا گیا! کئی ہفتہ شہر میں خوب ہنگامہ آرائی رہی، لاہور کے در و دیوار سے "ووٹ، ووٹ" کی صدائیں آتی تھیں۔

خدا خدا کر کے الیکشن کا دن آیا، اور امیدواروں نے اپنے مورچے سنبھال لئے، لاہور کے حلقۂ انتخاب میں ووٹ ڈالنے کے لئے ۴۶ پولنگ سٹیشن قائم کئے گئے تھے بارہ ہزار ووٹوں میں ۶۸ فی صد ووٹ ڈالے گئے۔ جن میں پانچ ہزار چھ سو پچھتر (۵۶۷۵)

---

[1] CIVIL & MILITARY GAZETTE, NOV. 30, & DEC. 8, 1926

ڈاکٹر صاحب کو اور دو ہزار چار سو اٹھانوے (۲۴۹۸) ان کے مقابل امیدوار ملک محمد دین کو ملے، گویا تین ہزار ایک سو ستتر ووٹوں کی بھاری اکثریت سے ڈاکٹر صاحب نے یہ الیکشن جیت لیا۔ اور اُن کے حریف کو شکستِ فاش ہوئی۔ یہ دراصل دولت اور شخصیت کی ٹکر تھی، اور اللہ کے فضل سے جیت شخصیت ہی کی ہوئی۔

جس وقت پولنگ کے نتائج کا اعلان ہوا ہے، راقم الحروف اس وقت ضلع کچہری کے الیکشن آفس میں تھا، ڈاکٹر صاحب کی کامیابی پر عوام فرطِ مسرت سے وارفتہ ہو گئے۔ ان آنکھوں نے ضلع کچہری کے باہر منتظر و مشتاق ہجوم کے جوش و خروش اور اظہارِ مسرت و شادمانی کا جو منظر دیکھا ہے، اس کی یاد ۳۹ سال گزرنے کے بعد بھی خود مجھ پر جوشِ مسرت کا عجیب عالم طاری کر دیتی ہے۔

رضاکاروں کا وہ جلوس، جو کل تک لاہور شہر میں "آگئی فوج اقبالی" کے ترانے گاتا تھا، آج کامیابی اور شادمانی کے نغمے بکھیرتا اور فتحمندی کے جھنڈے اُڑاتا ہوا ڈاکٹر صاحب کی قیام گاہ پر پہنچا، لوگوں نے جوشِ مسرت میں ڈاکٹر صاحب کو کاندھوں پر اٹھا لیا، جوشِ مسرت اور وفورِ عقیدت کا یہ سماں پھر دیکھنے میں نہیں آیا۔

؎ حوریاں رقص کناں نعرۂ مستانہ زدند

ڈاکٹر صاحب نے ان سب لوگوں کا اپنے خاص انداز میں شکریہ ادا کیا۔

کونسل کی تین سالہ رکنیت کے دوران ڈاکٹر صاحب نے قومی و ملکی مسائل پر تاریخی اہمیت کی کئی تقاریر کیں۔

نصابِ تعلیم

ڈاکٹر صاحب جس طرح قوم کی زبوں حالی پر غور کرتے رہتے تھے کہ اس کے کیا اسباب ہیں اور یہ کس طرح دُور ہو سکتی ہے اسی طرح انہیں نونہالانِ قوم کی صحیح ذہنی نشوونما اور معیاری تعلیم و تربیت کا بھی بڑا احساس تھا، وہ چاہتے تھے کہ نئی نسل اخلاق کے صحیح تقاضوں کے مطابق پروان چڑھے تاکہ وہ حکمرانی کی اہل اور مستحق بن سکے۔ چنانچہ انھوں نے بچّوں کے لیے تعلیمی نصاب کی ترتیب و تشکیل کی جانب عملی قدم اٹھایا اور میرے محترم بزرگ حکیم احمد شجاع صاحب سے کہا، کہ وہ اُن کی نگرانی میں اس کام کا آغاز کریں۔ اردو کورس کے نام سے چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کے لئے تین کتابیں ڈاکٹر صاحب کے خیال و رجحان کے مطابق مرتب ہوئیں۔ ان کتابوں میں نظم و نثر کے جو منتخب شہ پارے شامل کئے گئے، وہ بچّوں کی نفسیات ذہنی ہم آہنگی اور احساس ذمہ داری کے آئینہ دار تھے اور دراصل اُن کے ذہن و فکر کی تربیت کا ایسا اہتمام کیا گیا تھا کہ اُن میں نیک اور بہادر بننے کا جذبہ پیدا ہو۔

یہ کتابیں جب مرتب ہو گئیں، تو پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی (اردو سب کمیٹی) کے اجلاس[1] (۱۲ جنوری ۱۹۲۵ء) میں پیش کی گئیں، اور کمیٹی نے انہیں نصاب میں شامل کرنے

---

[1] (کارروائی اجلاس پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی منعقدہ ۱۲ جنوری ۱۹۲۵ء لاہور)
(فائل نمبر ۳/۳/۱۲ (۱۹۲۳ء) اردو کورسز دفتر ڈائرکٹر آف ایجوکیشن - لاہور)

کی باضابطہ منظوری دے دی۔

یہ تینوں اُردو کتابیں ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک محکمہ تعلیم پنجاب کی جانب سے سکولوں میں رائج رہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد میسرز گلاب چند کپور اینڈ سنز انارکلی لاہور کی طبع کردہ یہ کتابیں تعلیمی نصاب سے ایکا ایکی غائب ہو گئیں۔

ع خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیئے

ان تین کتابوں کے علاوہ میٹرک کے طلبہ کے لیئے ڈاکٹر صاحب نے ایک فارسی کتاب "آئینۂ عجم" بھی مرتب فرمائی تھی، جسے میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز نے شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تمام کوششیں ملک و قوم کے بچوں کی ذہنی نشوونما کے لیئے تھیں، ان مسائل پر وہ اپنے ذاتی مفاد کے نقطۂ نگاہ سے نہیں سوچتے تھے۔

مثال کے طور پر ایک بار پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے بذریعہ چٹھی نمبر ۱۶۵۱ مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۴ء ڈاکٹر صاحب سے اجازت چاہی کہ وہ اپنی مندرجہ ذیل نظمیں نصاب میں شامل کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

(۱) ہمالہ (۲) پیامِ صبح (۳) جگنو (۴) شعاعِ آفتاب

ڈاکٹر صاحب نے کسی تأمل کے بغیر اگلے ہی روز یعنی ۱۹ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعہ محکمہ تعلیم کو اپنی رضامندی سے مطلع کر دیا۔

نصاب کمیٹی کے خطوط اور ڈاکٹر صاحب کے خط کا نادر عکس ان صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

Punjab Text-Book Committee.

DRAFT LETTER

To

Dr. Sir Mohammad Iqbal, M. A., Ph.D., Etc.,

No. 1651

LAHORE.

Dated Lahore, the 18/10/24 192

18th October/24

Sir,

I have the honour to request the favour of your kindly permitting me to embody the following poems in the revised drafts of Urdu Courses I, II and III published by the Punjab Text Book Committee.

Name of Poem.	Page of Bang-i-Dara
1. Himala.	1.
2. Piyam-i-Subah.	47.
3. Jugnu.	83.
4. Shua-i-Aftab.	267.

I have the honour to be,

Sir,

Your most obedient Servant,

Secretary,

Punjab Text Book Committee.

(U. R).

محکمہ تعلیم پنجاب کا وہ خط، جو ڈاکٹر صاحب کی چار نظموں ہمالیہ، پیامِ صبح، جگنو، اور شعاعِ آفتاب کو اُردو نصاب میں شامل کرنے کیلئے لکھا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے بلا تامل ان نظموں کو اُردو کورس میں شامل کرنے کی منظوری دے دی، انگریزی طرزِ تحریر کا ایک نادر عکس!

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی جانب سے ڈاکٹر صاحب کو شکریہ کا خط

خطاب یا عتاب

اقبال کا شاید ہی کوئی تذکرہ مولوی میر حسن کے نام اور ذکر سے خالی ہو، اور ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ شاگرد کے ساتھ اساتذہ کے ناموں کا ذکر، یہ مشرق کے فنِ سیرت نگاری کی خصوصیت رہی ہے —— ہاں؛ تو مولوی میر حسن صاحب کو انگریزی حکومت کی جانب سے جب شمس العلماً کا خطاب ملا، تو انہی دنوں اُن کے صاحب زادے ڈاکٹر علی نقی شاہ سے گورنر ہاؤس میں میری ملاقات ہوئی، میں نے اُن کے والد کے خطاب یافتہ ہونے پر انہیں مبارک باد دی۔ ڈاکٹر علی نقی شاہ نے اس پر فوراً ہی کہا کہ جی ہاں! میں نے انہیں اس سلسلہ میں ایک خط لکھا تھا جس کا جواب آج ہی مجھے ملا ہے، کہ:۔

"میں خطاب سے اُتنا ہی ڈرتا ہوں، جتنا عتاب سے"

اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ مولوی میر حسن صاحب خطاب کی سرکاری سند لینے کے لئے گورنمنٹ ہاؤس نہیں آئے تھے۔

غازی علم الدین

پنجاب میں یوں تو سیاست و مذہب کے بہت سے ہنگامہ خیز دور گزرے ہیں، مگر ۱۹۲۳-۲۹ء کا زمانہ خاص طور سے ہنگامہ خیز بلکہ ہنگامہ آفریں تھا۔ ایک شخص تھا راج پال؛ ہسپتال روڈ پر اُس کی کتابوں کی دُکان تھی اور وُہ خود بھی ہندی زبان کا "بیباک" یعنی انشا پرداز تھا۔ اس بد زبان اور بد قلم نے ۱۹۲۳ء میں ایک کتاب لکھ کر شائع کی جس میں حضور

سرورِ کائنات کی ذاتِ اقدس پر رکیک حملے کئے ۔ میں اس رسوائے زمانہ کتاب کا نام لینا بھی سوءِ ادب ، اور شانِ رسالت میں گستاخی سمجھتا ہوں اور "نقلِ کفر" جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "کفر نباشد" میں اس کی جرأت بھی نہیں کر سکتا (معاذ اللہ)

اس کتاب کی اشاعت نے مسلمانوں میں غم و غصہ کی ایک نہ تھمنے والی لہر دوڑا دی ۔ یہ کتاب مسلمانوں کے عشقِ نبوی اور دینی حمیّت و غیرت کو کھلا چیلنج تھی ۔ مسلمانوں میں زبردست ہیجان کا انگریزی حکومت پر اگر تھوڑا بہت اثر ہوا تو وہ یہ کہ مصنف راج پال پر فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے الزام میں مقدمہ چلا ۔ ماتحت عدالت نے مقدمہ کی سماعت کے بعد ملزم کو دو سال قید سخت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دے دی ۔ لیکن عدالتِ عالیہ نے جس کے چیف جسٹس ان دنوں سر شادی لال تھے ، راج پال کو صاف بری کر دیا ۔ یہ واقعہ دل برداشتہ مسلمانوں میں مزید حزن و ملال پھیلانے کا سبب بنا ، جس کی ایک جھلک ۲۶ ستمبر ۱۹۲۷ء کو یوں نظر آئی ، کہ ایک مسلمان خدا بخش نے راج پال پر حملہ کر دیا ۔ حملہ ناکام رہا اور راج پال کی جان بچ گئی ؛ حملہ آور خدا بخش گرفتار کر کے سپردِ عدالت کیا گیا ۔ جہاں سے اُسے سات سال قید کی سزا سنا دی گئی ۔ اس واقعہ کے اگلے ماہ مسلمانوں میں پھیلے ہوئے اشتعال اور بے چینی کی ایک اور مثال دیکھنے میں آئی جبکہ ۹ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو پٹھان خاندان کے ایک نوجوان عبد العزیز نے گستاخانہ کتاب کے مصنف راج پال کو ٹھکانے لگانے کی دوسری کوشش کی ۔ لیکن راج پال کی خوش قسمتی کہ وہ اس بار بھی بال بال بچ گیا ۔ اُدھر عبد العزیز خاں پر قاتلانہ حملہ کے الزام میں مقدمہ چلا ، اور عدالت[1] سے اس نے چودہ سال قید کی سزا پائی ؛ واقعات کا یہ تسلسل شاہد ہے کہ مسلمان

[1] CIVIL & MILITARY GAZETTE OF APRIL, 8 1929

اُس زمانے میں ایک طرف اپنے مذہب کی بے حُرمتی اور جذبات مجروح کرنے کی ناپسندیدہ کوششوں سے دوچار تھے ، اور دوسری طرف قانون و انصاف کے معاملہ میں بھی انہیں کس قدر بے بس رکھا جا رہا تھا ۔

بہرحال ظُلم اور بے انصافی کی انتہا واقعات و حقائق کا خود ایک سنگین ردِ عمل ہوتی ہے ؛ اس کا اندازہ دنیا کو ۶ اپریل ۱۹۲۹ء کے اُس عبرت انگیز واقعہ سے ہوا ، جو مصنف راج پال کے قتل کی صورت میں پیش آیا ۔ علم الدین نام کا ایک غیرت مند نوجوان اُٹھا ، اور اس نے مسلمانوں کے دِلوں ، کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر دینے والی کتاب کے مصنف اور سرورِ کونین کی شانِ اقدس میں گستاخی کے مرتکب راج پال کو قتل کر دیا ۔ —— انار کلی لاہور کے اس مشہور حادثہ قتل کے بعد علم الدین کو گرفتار کر لیا گیا ! اور عدالت میں مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی ۔

ڈاکٹر صاحب جو ایک صادق عاشقِ رسول تھے ان واقعات سے بڑے متاثر تھے چنانچہ اُن کی محفلوں میں اکثر یہ موضوع زیرِ بحث رہتا ۔ ٹھیک ان دنوں جب علم الدین کے والد اپنے بیٹے کی مدافعت اور صفائی میں کسی اچھے وکیل کی خدمات حاصل کرنے میں سرگرداں تھے اور اُن کی نگاہِ انتخاب الٰہ آباد کے مشہور وکیل سر تیج بہادر سپرو پر پڑی ۔ میرے لئے یہ انتخاب بڑی حیرت کا باعث بن گیا ، چونکہ اس میں شک نہیں کہ سر سپرو ایک قانون دان کی حیثیت سے ملک کے طُول و عرض میں مشہور و معروف تھے ۔ مگر وہ ہندو تھے اور اس مقدمہ کی نوعیت ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ نزاع کی تھی ، میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا ۔

"علم الدین کے مقدمہ کی پیروی کے لئے مسلمانوں کی
نظریں سرتیج بہادر سپرو پر کیوں پڑ رہی ہیں؟"

ڈاکٹر صاحب نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔
"تمہیں شاید علم نہیں کہ سرتیج بہادر عربی کے سکالر
SCHOLAR ہیں تمہاری قوم میں کتنے وکلاء
ہیں جو اس علم اور اعزاز سے آراستہ ہیں۔"

میں نے ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر اُس وقت حزن و ملال کی کیفیت کا مشاہدہ کیا۔ وہ زبان سے کچھ نہ کہتے تھے، مگر اُن کے تیور زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے ذہن و فکر اور دل و دماغ بہت زیادہ متاثر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس مختصر سے جواب میں جو اشارہ کیا، میں اُس پر غور و خوض کے بعد یہ سمجھا کہ اسلامی تاریخ، پیغمبر آخرالزماں کی سیرت اور حضور کی جد وجہد کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے عربی زبان و ادب سے واقف ہونا ضروری ہے۔ صرف عربی کتابوں کے ترجمے پڑھ کر حضور کی شخصیت و سیرت کی عظمت پوری طرح سامنے نہیں آسکتی۔ غازی علم الدین کے مقدمہ کی ایسی ہی نوعیت تھی، اس میں وہی وکیل اور قانون داں اپنی قابلیت کے جوہر دکھا سکتا تھا، جو اس حقیقت سے واقف ہو کہ شانِ رسالت میں گستاخی کرنے سے خاص انسانی نقطۂ نگاہ سے کیا مضرتیں اور نقصانات ظہور میں آتے ہیں، اور ایک مردِ مومن کے جذبات کا بے قابو ہو جانا کس قدر فطری اور قدرتی امر ہے۔

شہادت!

قتل راج پال کے مقدمہ میں غازی علم الدین کو پھانسی دیئے جانے کے واقعہ کا اثر دوسرے مسلمانوں کی طرح میرے دوست محمد محمود صاحب پی سی ایس (جو اُس وقت فلسفہ کے طالب علم تھے) کے ذہن پر بھی تازہ تھا۔ چنانچہ ایک بار چند ساتھی طلباء کے ہمراہ وہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے براہِ راست سوال کر ہی دیا۔

"یہ ۔۔۔ کہ علم الدین کی موت شہادت ہے یا نہیں؟"

ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا، اس کا انحصار نیت پر ہے، اس کے بعد سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے توضیح کی۔ کہ اگر یہ حقیقت ذہن میں ہو کہ حملہ آور کا اصل مقصد پیغمبر کے ذاتی وقار کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اس کے لائے ہوئے پیغام کو مجروح اور اس ایمان محکم کو متزلزل کرنا ہے جو اس پیغام رُشد و ہدایت پر قائم و استوار ہے، تو یہ حملہ صرف انسانی یا پیغمبرانہ وقار کا قتل نہیں رہتا بلکہ اس ایمان اور عقیدہ کا قتل بن جاتا ہے اس کوشش یا اقدام کے خلاف ہر مدافعت یقیناً صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ہوتی ہے، اور وہی اُس کا ٹھیک ٹھیک اجر دینے والا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر، نہایت رقت انگیز لہجہ میں فرمایا:۔
"میں تو یہ بھی برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی شخص میرے
پاس آکر یہ کہے کہ تمہارے پیغمبر نے ایک دن میلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔"

شاعر اور وکیل

جس واقعہ کا میں ذکر کر رہا ہوں، اُن دنوں سر شادی لال پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے، اُسی زمانہ میں برطانوی حکومت کے سامنے ڈاکٹر اقبال کو ہائی کورٹ کا جج مقرر کرنے کی تجویز زیرِ غور تھی حکومت نے سر شادی لال کی رائے دریافت کی، کہ چیف جسٹس کی حیثیت سے جج کے تقرر کے لئے اُن سے مشورہ کرنا ضروری تھا سر شادی لال نے اس تجویز کی مخالفت کی اور مخالفانہ رپورٹ کا یہ جملہ خوب مشہور ہوا۔

" WE KNOW HIM AS A POET, BUT WE
DO NOT KNOW HIM AS A LAWYER "

"سجع"

اُن دنوں پڑھے لکھے لوگوں میں اپنی ذات یا کسی دوست اور عزیز کے متعلق سجع کہنے کا خاصا رواج تھا۔ سجع کی صنف میں یہ خوبی ہے کہ ذاتی محاسن یا فکری رجحان کو اس خوبصورت پیرایہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ ممدوح کا نام مصرعہ کے مفہوم کا ایک دلکش حصہ بن جاتا ہے، چنانچہ مجھے اپنے والد مرحوم سے کئی بزرگوں کے متعلق بڑے دلچسپ سجعات سننے کا موقع ملا جنھیں دُہرانے کا یہ موقع نہیں، تاہم ڈاکٹر صاحب نے اپنے متعلق جو سجع کہا تھا۔ اور جسے میں نے تقریباً چالیس سال قبل اپنے والد گرامی سے سُنا، بیان کر دینا دلچسپی سے خالی نہیں۔

سجع یہ تھا ؎

"دارو اُمیدِ شفاعت زمحمدؐ اقبال"

پانچ سو اشعار

ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم جس زمانے میں انار کلی کے دو منزلہ مکان میں رہتے تھے انہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ جسے صرف ایک واقعہ سمجھ کر سُن لینا اور پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ خود مرحوم کے اس شعر کے پس منظر میں کہ ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہُوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

اس پر جتنا بھی غور کیا جائے، ذہن و فکر کو نئی لذّت اور بالیدگی حاصل ہوتی ہے اور شعور و احساس کی دنیا وجدان و وارداتِ قلبی کی آئینہ دار بن جاتی ہے، یہ واقعہ شاعرِ مشرق کی شعر گوئی کے سب سے نمایاں پہلو کو پیش کرتا ہے، یہ سرسری طور پر گزر جانے کا نہیں، ٹھہرنے غور کرنے اور لطف لینے کا مقام ہے۔

ہوا یوں کہ ایک بار رات گئے سوتے سوتے علامہ مرحوم کی آنکھ کُھل گئی دیکھا بلکہ محسوس کیا کہ قلب پر شعر گوئی کی وہ خاص کیفیت طاری ہے، جس کا ذکر انہی صفحات میں اجمالاً آچکا ہے، یہ وہ عالم ہے۔ جسے شاعری کی زبان میں "آمد" سے تعبیر کیا جاتا ہے؛

ڈاکٹر صاحب مکان کی دوسری منزل پر استراحت فرما تھے، پاس نہ کاغذ تھا نہ پنسل، چُپ چاپ اُٹھے، لالٹین ہاتھ میں اٹھائی اور سیڑھیوں سے قدرے تیزی کے ساتھ اُتر کر نچلی منزل میں پہنچے لالٹین ایک طرف رکھ دی کاغذ اور قلم سنبھالا۔ اور جس قدر اشعار اُس وقت موزوں ہوتے گئے، اُنہیں قلم بند کرتے گئے۔ یہاں تک کہ نزولِ شعر کی یہ کیفیت

اختتام کو پہنچی۔ انہوں نے بالائی منزل پر جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایک سفید ریش، طویل قامت، درویش صفت بزرگ نظر آئے، ڈاکٹر صاحب نے حیرت و استعجاب کے انداز میں دریافت کیا، آپ کون ہیں؟ اور کیا چاہتے ہیں؟ درویش نے دونوں ہاتھ اُٹھاتے ہوئے جلدی جلدی کہا:-

"پانچ سو آدمی پیدا کرو ــــ پانچ سو آدمی پیدا کرو"

یہ کہتے ہوئے وہ بازار کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف بڑھتے گئے۔ حالانکہ اُس طرف کوئی راستہ نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے لالٹین اُٹھائی، اور زینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جہاں گھُپ اندھیرا تھا۔ کہا۔ چلئے میں آپ کو راستہ دکھاؤں اور نیچے تک لے چلوں؛ لیکن اُن مردِ بزرگ نے ڈاکٹر صاحب کی اس پیشکش کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنا وہی فقرہ اُسی جوش اور تاکید کے ساتھ دُہراتے ہوئے نظر سے اوجھل ہو گئے ــــ ڈاکٹر صاحب نے زینہ کی طرف سے سیڑھیاں طے کر کے بازار میں آئے اور دُور تک دیکھا، مگر بزرگ کا کہیں پتہ نہ تھا، جیسے وہ ڈاکٹر صاحب سے اپنے اس جملہ کو کہنے کے لئے ہی تشریف لائے تھے اور وہ جملہ کہہ کر غائب ہو گئے۔ اس اثناء میں ڈاکٹر صاحب کو رات میں گشت کرنے والا کانسٹیبل نظر آیا، اُس سے دریافت کیا کہ تم نے اس وضع قطع، چال ڈھال اور حُلیہ کا کوئی آدمی تو نہیں دیکھا، کانسٹیبل نے نفی میں جواب دیا، ڈاکٹر صاحب مایوس ہو کر اپنے گھر لوٹ آئے، اور پھر بستر پر سو گئے۔ صبح کو جب بیدار ہوئے، تو رات کا واقعہ ذہن میں بالکل تازہ تھا، مگر پھر خیال آیا کہ شاید انہوں نے خواب دیکھا ہے۔ لیکن جب نچلی منزل میں آکر رات کے لکھے ہوئے اشعار موجود پائے اور قریب ہی لالٹین رکھنے کا نشان بھی اُبھرا ہوا

تھا، تو ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ وہ خواب تھا یا بیداری تھی، بہرحال جو حالت بھی تھی اس کا ایک حصہ حقیقت بن چکا ہے۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر چند دن کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم موسمِ گرما کی تعطیلات میں جب سیالکوٹ تشریف لائے، تو اپنے والدِ بزرگوار سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ شیخ اعجاز احمد اس وقت وہاں موجود تھے، اُن کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے واقعہ سنانے کے بعد اپنے والدِ محترم سے دریافت کیا کہ "پانچ سو آدمی تیار کرنے سے" اس درویش کی کیا مُراد تھی؟ تو انہوں نے فرمایا "پانچ سو آدمی پیدا کرنے" کی فرمائش، پھر اس پر تاکید، اس کا حقیقی مفہوم تو میں نہیں بتا سکتا۔ مگر تم پانچ سو آدمی تیار نہیں کر سکتے۔ تو پانچ سو آدمی تیار کرنے والی پانچ سو اشعار کی کتاب ہی لکھ دو۔"

اس واقعہ کو ذہن میں رکھ کر، قارئین کرام ڈاکٹر صاحب مرحوم کی مشہور مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کا تصور کریں بلکہ اسے ایک بار پڑھیں۔ اس کے شعروں کی تعداد ۵۳۱ ہے یعنی پانچ سو اشعار سے کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ؛ خاص طور پر ذکر کے قابل بات یہ ہے کہ اس مجموعہ کلام کا آغاز ہی اس شعر سے ہوتا ہے۔

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

آگے چل کر فرماتے ہیں:-

زمانہ ہیچ نداند حقیقتِ اُو را — جنوں قباست کہ موزوں بہ قامتِ خرد است
بآں مقام رسیدم چو در برش کردم — طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرد است

عجیب اتفاق ہے کہ ابھی یہ کتاب زیرِ ترتیب ہی تھی کہ اچانک ماہنامہ "افکار" کراچی کے شمارہ اپریل ۱۹۶۲ء میں مدیرِ افکار جناب صہبا لکھنوی کے بزرگ محترم پروفیسر سید نواب علی مرحوم کا ایک نہایت قیمتی مقالہ بعنوان "پس چہ باید کرد" نظر آیا۔ راقم الحروف نے اس مقالہ کو بار بار پڑھا اور پھر اس کا پس منظر معلوم کرنے کے لئے مدیرِ افکار سے رابطہ قائم کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ مقالہ پروفیسر نواب علی نے سب سے پہلے ۱۹۳۵ء میں شائع کرایا تھا۔ اس کے بعد بھی چھپتا رہا۔ اور افکار نے کسی پرانے حوالہ سے ہی اسے ۱۹۶۲ء میں نذرِ قارئین کیا ہے۔ پروفیسر نواب علی درجنوں کتابوں کے مصنف اور ڈاکٹر صاحب کے حلقہ احباب میں سے تھے۔ قیام بھوپال کے دوران ڈاکٹر صاحب سے ان کی طویل ملاقاتیں رہیں۔ دونوں کے درمیان خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ مثنوی "پس چہ باید کرد" سے متعلق ان کا یہ مقالہ ظاہر ہے ان کے اور ڈاکٹر صاحب کے مابین دوستانہ تبادلۂ خیال کا نتیجہ ہے اور ممکن ہے "پانچ سو اشعار" کے موضوع پر انہیں انار کلی والے واقعہ کا پس منظر معلوم ہو۔ لیکن بدقسمتی سے پروفیسر نواب علی گذشتہ سال کراچی میں انتقال کر چکے ہیں۔ اور اب ان کے زیرِ نظر مقالہ کے علاوہ "پانچ سو اشعار" والی کتاب کے لئے مزید کوئی شہادت موجود نہیں۔

مرحوم نے اپنے اس خیال افروز مقالہ کی تمہید کے طور پر جو سطور قلم بند فرمائی ہیں۔ ان کا مطالعہ قارئین کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں۔

"—— ڈاکٹر محمد اقبال نے وفات سے دو سال پیشتر مولائے رومؒ کی شہرۂ آفاق مثنوی کی پیروی میں پانچ سو اشعار کی ایک چھوٹی سی فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" لکھی۔ جو اُن

کے افکارِ عالیہ کا ایک صاف و شفاف آئینہ ہے۔ مولوی معنوی کی مثنوی کی طرح اس میں بھی وہی جوش، وہی سوز اور وہی تخیّل ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا زبان پہلوی کے "قرآن" کا سورۂ اخلاص ہے!

انسان کی پناہ

شیخ اعجاز احمد جو ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بھتیجے ہیں، چونیاں میں سب جج کے عہدے پر مامور تھے۔ وہاں ایک گیانی سکھ تھا جس کی تقریر کی بڑی دھوم تھی، جادو بیان تھا۔ شیخ صاحب بھی اُس کی تقریر سننے کے شوق میں گاہے بگاہے سکھوں کے گوردوارے جایا کرتے تھے، بیدی خاندان کا یہ گرنتھی انار کلی گردوارہ میں بھی رہ چکا تھا، بڑے کھلے دل سے گفتگو کرتا۔ ایک دن وہ شیخ صاحب کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں، مجھے ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں لے چلئے۔

موسمِ گرما کی تعطیلات ختم ہوتے ہی شیخ اعجاز احمد اس سکھ مقرر کو اپنے ہمراہ لے کر لاہور آئے، اور ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے: سکھ مقرر نے پہلے اپنے مشرف بہ اسلام ہونے کا ارادہ ظاہر کیا —— پھر بولا:۔ کہ میرے بہت سے بال بچے ہیں، خرچ زیادہ ہے، آمدنی کم ہے کیا اچھا ہو کہ مسلمان ہونے کے بعد میری مالی امداد کی بھی کوئی صورت نکل آئے۔

ڈاکٹر صاحب اُس گیانی سکھ کی زبان سے مالی امداد کا ذکر سن کر متاثر بلکہ متاسف

ہوئے انہوں نے فرمایا — اوّل تو مسلمانوں کے پاس ایسا کوئی ادارہ نہیں ہے جہاں سے نومسلموں اور ضرورت مندوں کی مالی امداد کی جاتی ہو، دوسرے مسلمان ہونے کے لئے مالی امداد کی شرط، یہ بات کسی طرح پسندیدہ نہیں ہے، اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک واقعہ سنایا۔ کہ میرے والد ضلع گوجرانوالہ میں ایک بزرگ سے ملنے کے لئے گئے، یہ بزرگ گاؤں سے باہر چارپائی پر بیٹھے ہوئے چند صاحبوں سے باتیں کر رہے تھے، اتنے میں ایک جنگلی خرگوش جس کے پیچھے کتے لگے ہوئے تھے، بھاگتا ہوا ادھر آیا اور چارپائی کے نیچے بیٹھ گیا! اُس خرگوش کا جو کتے تعاقب کر رہے تھے، وہ چارپائی پہ آدمیوں کو بیٹھا دیکھ کر ٹھہر گئے، بلکہ یُوں کہئے ٹھٹک کر رہ گئے: وہ بزرگ یہ منظر دیکھ رہے تھے، انہوں نے خرگوش کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"اے عقلمند پناہ بھی لی تو انسان کی"

ڈاکٹر صاحب یہ واقعہ سنا رہے تھے، اور ان کا چہرہ تمتماتا جا رہا تھا یہاں تک کہ اُن پر رقت طاری ہوگئی، انہوں نے صوفے پر اپنی ٹھوڑی رکھ دی اور زار و قطار رونے لگے۔ اُن کی آنکھوں کے آنسو جو ابھی تک چھلک رہے تھے اب موتیوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔

سرابے کہ رخشد بہ ویرانہ خوش تر
ز چشمے کہ پیرایۂ نم ندارد!

——— اور ———

ڈاکٹر اقبال کی آنکھیں گریہ سحری کے علاوہ بھی شبنم آلود ہوتی رہتی تھیں، وہ

سراپا سوز تھے۔ گیانی سکھ نے اس حکیمانہ مثال کو کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا خاموشی کے ساتھ چلا گیا۔

یادگار سگریٹ

ڈاکٹر صاحب ایک بار سیالکوٹ سے ریل گاڑی میں لاہور جا رہے تھے، شیخ اعجاز احمد بھی اس ٹرین سے انٹر کلاس میں سفر کر رہے تھے، سمبڑیال اسٹیشن پر جب ٹرین ٹھہری، تو شیخ صاحب سکینڈ کلاس میں ڈاکٹر صاحب سے کھانے کے لئے دریافت کرنے کی غرض سے آئے: اسی ڈبے میں ککے زئی خاندان کے ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے، جب انہیں پتہ لگا کہ شاعرِ مشرق اُن کے ہم سفر ہیں۔ تو انہوں نے حیرت و مسرت کے ملے جلے انداز میں کہا "یہ ڈاکٹر محمد اقبال ہیں؛ ان سے میرا تعارف کرا دیجئے"۔

ڈاکٹر صاحب نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اُن سے ہاتھ ملایا اور اپنی سگریٹ کی ڈبی کھول کر ایک سگریٹ پیش کی، ہم سفر بزرگ نے ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ سے وہ سگریٹ لے لی مگر سگریٹ کو سُلگانے کی بجائے اُسے جیب میں رکھ لیا۔ ڈاکٹر صاحب کو حیرت ہوئی، انہوں نے پوچھا کہ آپ نے سگریٹ سُلگائی نہیں، وہ صاحب بولے کہ یہ متبرک سگریٹ میرے خاندان میں یادگار کے طور پر محفوظ رہے گی۔ ڈاکٹر صاحب اس پر مسکرا دئیے انہوں نے دوسری سگریٹ دیتے ہوئے فرمایا اچھا تو اس سے شوق فرمائیے؛ ہم سفر بزرگ نے اس سگریٹ کو بھی سلگائے بغیر جیب میں رکھ لیا ——— ڈاکٹر صاحب متبسم ہو کر چُپ ہوگئے۔

نبیرہ بیگم - منیبہ - خترتمیہ
رضیہ بیگم - عاصمہ
انوری بیگم
قرۃ العین - سعیدی بیگم - خجستہ بیگم
فروغ فاطمہ - سلیمہ
اسماء

اسلامی طرز کے نام

ڈاکٹر صاحب کو اسلامی طرز کے نام رکھنے کا کس قدر شوق تھا، اس کا اندازہ مندرجہ بالا فہرست سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے شیخ اعجاز احمد کے ہاں لڑکی پیدا ہونے پر اپنے قلم سے لکھ کر بھیجی۔

اس واقعہ کا یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی ہی میں اُن کی قابلیت ناموری اور شہرت کا سکہ بیٹھ چکا تھا، اور لوگوں کے دل اُن کی محبت اور عقیدت سے معمور ہو گئے تھے

نظم "شکوہ"

۱۹۱۱ء کا واقعہ ہے جب انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی مشہور نظم "شکوہ" خاص انداز میں پڑھی؛ ڈاکٹر صاحب کی عمر اُس وقت ۳۵ سال کی تھی، رواز ہوسٹل کے اس تاریخی اجتماع اور روح پرور اجلاس میں ڈاکٹر صاحب کے والد شیخ نور محمد بھی موجود تھے اور نامور فرزند کے شاعرانہ کمال اور ہر دلعزیزی کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب جب نظم پڑھ چکے تو ان کے ایک بڑے مداح اور قدر شناس خواجہ صمد آگے بڑھے اور جوشِ مسرت میں اپنا قیمتی دوشالہ ڈاکٹر صاحب کے شانوں پر ڈال دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ دوشالہ اُسی وقت انجمن کے منتظمین کو دے دیا، اس کے بعد یہ "یادگار اور متبرک دوشالہ" اس مجمعِ عام میں نیلام کیا گیا، اور سب سے بڑی بولی ختم ہونے پر، جو رقم وصول ہوئی وہ انجمن حمایتِ اسلام کی تحویل میں دے دی گئی۔

خواجہ صمد ایک خوشحال تاجر اور صاحب دل انسان تھے، ڈاکٹر صاحب ان کی بڑی عزت کرتے تھے، خواجہ صاحب کے صاحبزادے کا جب انتقال ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے مرثیہ کہا، جس سے اُن کے تعلقِ خاطر کا صاف پتہ چلتا ہے؛

چوہدری رحمت علی

چوہدری رحمت علی پاکستان بننے کے بعد خاصے مشہور ہوگئے ہیں، اور ایک خاص تحریک چل رہی ہے، جس کے ذریعہ ان کو پاکستان کا اصل مجوّز اور بانی قرار دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر ۱۹۳۲ء میں لندن میں اس موضوع پر ایک پمفلٹ شائع کرکے تقسیم کیا تھا۔ لیکن عملاً چوہدری رحمت علی، ڈاکٹر صاحب کے اُن چند عقیدت مندوں میں سے ایک تھے۔ جو انگلستان سے ۱۹۰۸ء میں ڈاکٹر صاحب کی واپسی کے بعد، اُن کی خدمت میں اکثر و بیشتر حاضر ہوا کرتے تھے۔

۱۹۱۶ء کے لگ بھگ کی بات ہے جب اسلامیہ کالج لاہور کے سینیئر طلبا جن میں سیالکوٹ کے چوہدری محمد حسین بھاٹڑگی اور چوہدری رحمت علی قابل ذکر ہیں ڈاکٹر صاحب کی مجلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے؛ یہ طلبا شعر و شاعری سے گہرے شغف کے علاوہ قومی اور مذہبی تحریکوں سے پُرجوش دل چسپی رکھتے تھے؛ ڈاکٹر صاحب ان نوجوان جوشیلے طلبا کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے اور اپنے علمی فیوض سے استفادہ کا زیادہ سے زیادہ موقعہ دیتے یہ وہ زمانہ ہے جب ڈاکٹر صاحب کی شاعری اور شہرت کا آفتاب پُورے عروج پر تھا، اور بڑے بڑے لوگ اور عظیم شخصیتیں اُن کی خدمت میں حاضر ہونا اپنے لئے سعادت و عزت کا سبب سمجھتی تھیں۔

طلبا کے اس گروپ کی آمد و رفت بعد میں ڈاکٹر صاحب کے باقاعدہ حلقہ احباب

میں تبدیل ہوگئی؛ جذبات میں اخلاص شامل ہو، تو عقیدت کا دوسرا رُخ دوستی بھی بن جاتا ہے؛ چنانچہ یہی چوہدری محمد حسین آگے چل کر ڈاکٹر صاحب کے نہایت قریبی دوست اور معتمد بن گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس دوستی، اعتماد اور قربت کے سبب، ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد اُن کے بچوں کے چار ولی مقرر ہوئے، اُن میں منشی طاہر الدین، شیخ اعجاز احمد اور چوہدری محمد حسین شامل تھے۔

چوہدری محمد حسین ایم۔ اے اور چوہدری رحمت علی کی ڈاکٹر صاحب سے نیاز مندی کے آغاز کا زمانہ وہ ہے جب ڈاکٹر صاحب کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم پاتے تھے اور ان دونوں حضرات سے دو سال پیچھے تھے؛ شیخ صاحب کا بیان ہے کہ اسلامیہ کالج کے مشاعروں میں چوہدری محمد حسین بھاٹڑگی بھی اپنے اشعار سناتے۔ چوہدری رحمت علی نے آگے چل کر قومی تحریکوں میں جس طرح حصہ لیا، اس میں ڈاکٹر صاحب کا فیضِ صحبت شامل تھا۔

پیغمبر کا تذکرہ

ڈاکٹر محمد اقبال نے طالب علمی کے زمانہ ہی سے اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں میں انفعالیت کی جگہ جرأت پیدا ہو، وہ دنیا کے تمام مذاہب پر اپنے دینی تفوق کو محسوس کریں، اور قومی عظمت کا احساس اُن کے اندر بیدار ہو۔ چوہدری نبی احمد اسسٹنٹ سکریٹری لیجسلیٹو اسمبلی مغربی پاکستان نے اس کی تائید میں اس واقعہ کو بیان کیا کہ جن دنوں میں اور میرے ہم عصر خواجہ عبد الرحیم گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے طالب علم

تھے، تو مسلمان طلبہ کا یہ عالم تھا کہ ہندو، سکھ اور عیسائی طلبا کے ساتھ بیٹھ کر اپنے پیغمبر کا ذکر دوسرے مذہبی رہنماؤں کے مقابلہ میں تفوق کے ساتھ کرتے ہوئے جھجکتے تھے، مسلم طلباء کی گفتگو اس موضوع پر اوّل تو مختصر ہوتی۔ پھر اندازِ گفتگو میں مصلحت شناسی کی خاصی جھلک پائی جاتی، چوہدری نبی احمد کہتے ہیں کہ یہ اقبال ہی تھے، جنہوں نے مسلمان طلبا میں اسلامی قومیت اور اپنی مذہبی عظمت کا شعور پیدا کیا، اور سوسائٹی کی خوشنودی کے لئے بنائے ہوئے اس نمائشی بُت کو پاش پاش کر دیا۔ علامہ اقبال ہی کی بدولت مسلم طلباء میں یہ اخلاقی جرأت پیدا ہوئی کہ وہ معذرت آمیز انداز کے بجائے کُھل کر پوری جرأت کے ساتھ اسلام کی جامعیت اور اپنے نبیؐ کی عظمت بیان کرنے لگے۔

چوہدری صاحب کا بیان ہے کہ اقبال کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے، جسے ہم زندگی کے آخر لمحہ تک فراموش نہیں کر سکتے، اقبال نے ہم میں روباہی کی جگہ اسد اللّٰہی پیدا کی۔

سرسیّد کی تاریخ وفات

علی گڑھ کالج کی بنا سرسیّد احمد خاں نے ڈالی تھی، پھر یہ کالج ترقی کر کے یونیورسٹی بن گیا، مسلمانوں میں مغربی علوم کی ترویج کی روحِ رواں سرسیّد احمد خاں ہی تھے، ان کا جب انتقال ہُوا تو ہندوستان کے مسلمانوں میں صفِ ماتم بچھ گئی، اُن کی موت کو بہت بڑے قومی اور علمی نقصان سے تعبیر کیا گیا! ڈاکٹر صاحب ان دنوں ایم اے کے طالب علم تھے۔ انہوں نے بھی اس سانحہ کو شدت سے محسوس کیا کہ سرسیّد احمد خاں کی وفات سے مسلمانانِ ہند کی تعلیمی جدوجہد میں زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے! اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کے استادؒ

مولوی میر حسن صاحب کا پیغام اُنہیں ملا کہ سرسیّد کی وفات اس دَور کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے، مسلمانوں کی تعلیمی بے حسی کو دور کرنے کے لئے سرسیّد نے جو شاندار کارنامہ انجام دیا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا، تم اس موقعہ پر مرحوم کی تاریخ وفات کہو اور میں بھی اس کے لئے فکر کرتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب سرسیّد کی وفات کے سانحہ سے خود بھی متاثر تھے، قابلِ احترام استادؒ کی ہدایت نے اس تاثر کو اور گہرا کیا۔ استاد اور شاگرد دونوں نے "تاریخیں" نکالیں، اور مادہ ہائے تاریخ کے انتخاب کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی، اُس کمیٹی نے مولوی میر حسن اور ڈاکٹر اقبال کی تاریخوں کو بہترین قرار دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی نکالی ہوئی تاریخ وفات سر سیّد احمد خاں کی لوحِ مزار پر کندہ کرائی گئی جو اب تک موجود ہے۔ شمس العلماء مولوی سیّد میر حسن کی نکالی ہوئی تاریخ وفات یہ تھی۔

غُفِرَلَہٗ (۱۳۱۵ھ)

(مفہوم۔ اُس کی مغفرت کی گئی)

ڈاکٹر صاحب نے قرآنِ پاک کی آیت سے تاریخ نکالی۔

اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُكَ ط (۱۳۱۵ھ)

یہ آیہ مبارکہ سورۂ آلِ عمران (پارہ تلک الرسل) کا ایک جزو ہے۔ اس میں حضرت عیسٰے علیہ السلام کے لئے خداوند قدوس کی اُس خوشنودی کا اظہار کیا گیا ہے۔ جس میں یقین دلایا گیا ہے، کہ "وہی موت دینے والا ہے، وہی درجات بلند کرنے والا اور پاک کرنے والا ہے (الزامات اور بہتان طرازیوں سے)" یہ آیت حضرت مسیح علیہ السلام کی شانِ رفعت

اور سیرت و کردار کی پاکیزگی کو بھی ظاہر کرتی ہے اور اُن کے تہمت لگانے والوں کے مقابلہ میں کھلا ہوا چیلنج ہے ـــــ ڈاکٹر اقبال نے اس آیت سے تاریخ نکال کر سرسید کی شخصیت کا بڑا حسین اعتراف کیا ہے، سرسید احمد خاں کی وفات کی تاریخ، اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی تھی، یا ان کی علمی و قومی خدمات کو اس سے بہتر خراج عقیدت کیا پیش کیا جا سکتا تھا؛

ڈاکٹر صاحب کی منتخب آیتہ کی شان نزول، ترجمہ اور مفہوم کے ساتھ ساتھ سرسید احمد خاں کی زندگی اور تحریک سے متعلق مشکلات و واقعات کا تجزیہ کرنا عبرت اور افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ اور یوں یہ اندازہ کرنا بھی آسان ہو جائے گا۔ کہ سرسید احمد خاں کے لئے ان کے زبردست تعلیمی مشن کی بدولت ڈاکٹر صاحب کے دل میں کیا قدر و منزلت موجود تھی۔

عشقِ رسُول

میرے عزیز دوست محمد محمود پی سی ایس جنرل منیجر سمال انڈسٹریز حکومت مغربی پاکستان کے عہدے پر فائز ہیں ۱۹۳۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے طالبعلم تھے، اُن کا آبائی وطن سیالکوٹ ہے اور وہ شاعر مشرق کے اُن خوشہ چینوں میں شامل ہیں جنہیں مرحوم سے بالمشافہ گفتگو کی سعادت حاصل رہی ہے، ایک بار فلسفہ کے دُوسرے طلبا کے ہمراہ وہ ڈاکٹر صاحب سے تبادلہ خیال کرنے اور علمی معلومات حاصل کرنے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں اُن کے پاس گئے، اور ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں عرض کیا ـــــ ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ آنحضرتؐ جب چلتے تو درخت تعظیم سے جھک جاتے، ہمیں یقین

ہے کہ عمرؓ جھوٹ نہیں بولتے تھے، لیکن ہمارا دعویٰ تو یہ ہے، کہ ہمارا نبی انسانیت کے لئے نمونہ ہے، لیکن اگر قدرت کے مظاہر نبی کے لئے مختلف ہوں اور ہمارے لئے مختلف؛ تو پھر نبی نمونہ تو نہیں بن سکتا۔

ڈاکٹر صاحب نے بلا تامل جواب دیا۔ تم بالکل سچ کہتے ہو، کہ حضرت عمرؓ جھوٹ نہیں بولتے تھے، بات یہ ہے کہ یہ واقعہ پڑھ کر تمہارا ذہن مختلف راستہ پر منتقل ہو گیا ہے، تم اُلجھ کے رہ گئے ہو قدرت کے مظاہر اور درختوں کے جُھکنے میں۔

بھائی؛ یہ واقعہ تو صرف عمرؓ کا عشق بتاتا ہے کہ اُن کی آنکھ یہ دیکھتی تھی، کہ درخت جُھک رہے ہیں؛ اس کا درختوں کے جُھکنے کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں؛

اگر تمہیں عمرؓ کی آنکھ نصیب ہو تو تم بھی دیکھو گے کہ دنیا اُن کے سامنے جُھک رہی ہے۔ ؎

عقل انسانی ہے فانی زندہ جاوید عشق

نوبل پرائز

ان ہی طلباء نے جن میں محمد محمود صاحب بھی شامل تھے۔ ایک بار نوجوان طلباء کے لئے ڈاکٹر صاحب کی فراخ دلانہ روش سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے یہ عجیب سا سوال کر دیا۔ کہ

آپ کو نوبل پرائز (NOBEL PRIZE) کیوں نہیں ملا؟

فلسفی طلباء کا خیال یہ تھا۔ کہ جب دنیا کی بڑی بڑی سرکردہ شخصیتوں، اور

ہندوستان میں بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور تک کو نوبل پرائز مل چکا ہے تو ڈاکٹر صاحب اس قدر ممتاز اور مشہور شخصیت ہونے کے باوجود اس عالمگیر اعزاز سے کیوں محروم ہیں۔

ڈاکٹر صاحب جو طلباء کے ہر سطح کے سوالات کو خندہ پیشانی سے سُن لیا کرتے تھے۔ قدرے مسکرائے اور فرمایا :۔

"اگر مجھے نوبل پرائز مل چکا ہوتا، تو پھر مجھ سے یہ سوال کیا جانا چاہیئے تھا۔ کہ میں کون سے کارہائے نمایاں انجام دینے پر اس کا مستحق سمجھا گیا ہوں ۔۔۔۔۔ لیکن نہ ملنے پر تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"

ڈاکٹر صاحب کے اس انکسار اور دلیل آمیز جواب کے بعد طلباء کے لئے اس موضوع پر بحث کی مزید گنجائش نہ رہی ۔۔۔۔۔:

بنارس یونیورسٹی

محمد محمود صاحب ایک دن اپنے احباب کے ہمراہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر تھے کہ ڈاکٹر صاحب نے یکایک پوچھ لیا۔

بھئی آپ نے

RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM

کے موضوع پر میرے لیکچرز پڑھے ہیں :

(ڈاکٹر صاحب نے مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف ساؤتھ انڈیا کے زیر اہتمام انگریزی زبان میں یہ چھ لیکچرز ۱۹۲۸ء میں مدراس میں دیئے تھے جو ۱۹۳۰ء میں

مندرجہ بالا عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے تھے۔)

محمود صاحب نے ندامت کے ساتھ عرض کیا۔ نہیں !

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ اگر تم ہاں کہتے تو مجھے تعجب ہوتا۔ چونکہ میں نے اب تک کئی مسلمان دوستوں سے یہ سوال کیا ہے لیکن سب نے یہی کہا، کہ انہوں نے یہ کتاب نہیں پڑھی ہے، ڈاکٹر صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا لیکن یہ کس قدر عجیب اتفاق ہے کہ بنارس یونیورسٹی کے ہندو طلباء نے یہ لیکچرز نہ صرف پڑھے ہیں۔ بلکہ ایک ملاقات میں انہوں نے مجھ سے ان تقریروں سے متعلق متعدد سوالات کئے : اور بیان کئے ہوئے نکات پر مجھ سے طویل جرح اور بحث کرتے رہے۔

جناب محمد محمود اور اُن کے ساتھی ڈاکٹر صاحب کے اس انکشاف پر حیران رہ گئے :

سفرِ یورپ

میرے عزیز سید امجد علی جو پاکستان کے وزیر خزانہ اور امریکہ میں اپنے ملک کی سفارت اور دوسرے عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں، ڈاکٹر محمد اقبال سے دیرینہ اور نیاز مندانہ تعلق خاطر رکھتے ہیں ، یہ تعلق اس لئے اور بھی خصوصی ہو گیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جب ہندوستان کے سیاسی مستقبل پر غور و خوض کرنے کے لئے لندن میں منعقد ہونے والی دوسری اور تیسری گول میز کانفرنسوں میں شرکت کے لئے انگلستان کا سفر کیا۔ تو سید امجد علی بھی ایک بار ان کے رفیق سفر رہے دوسری گول میز کانفرنس لندن میں ، ستمبر ۱۹۳۱ء کو شروع ہوئی اور یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو اختتام پذیر ہوئی۔ تیسری گول میز کانفرنس ، نومبر ۱۹۳۲ء کو شروع ہوئی



دوسری گول میز کانفرنس لندن میں ڈاکٹر محمد اقبال (دائیں طرف) کی شرکت کا ایک تاریخی منظر
ان کے بائیں طرف مولانا شوکت علی دائیں طرف دوسرے نمبر پر سر عبدالقادر اور چھٹے نمبر پر سید امجد علی بیٹھے ہیں

اور ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو ختم ہو گئی، ڈاکٹر سر محمد اقبال ان میں مسلمانانِ ہند کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے، اور سید امجد علی مسلم ڈیلی گیشن کے آنریری سیکرٹری کی حیثیت سے — گول میز کانفرنس میں شریک رہے۔

یورپ کے اس سفر کی سیاسی اہمیت اس لئے اور بھی زیادہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے بعد یہ سفر کیا تھا ۱۹۳۰ء کا یہ وہی اجلاس تھا۔ جس میں ڈاکٹر صاحب نے پہلی بار نظریہ پاکستان کو اپنے خطبۂ صدارت میں پیش کیا — اس طرح انہوں نے گویا سیاسی افکار و آراء کی دنیا میں پاکستان کا سنگِ بنیاد نصب کر دیا

اس تاریخی سفر، قیام یورپ اور کانفرنسوں کے دوران متعدد ایسے واقعات مشاہدات اور ملفوظات کا سلسلہ جاری رہا جنہیں اگر سید امجد علی اب بھی قلم بند نہ کراتے تو علم و ادب، تاریخ اور اخلاق و سیاست کا یہ سرمایہ ہمیشہ کے لئے ضائع ہو جاتا۔ بعض یادگار تصویروں نے ان واقعات کا لطف دوبالا کر دیا ہے۔

۱۹۳۲ء کی تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن جاتے ہوئے جب ڈاکٹر صاحب کا جہاز بندرگاہ "وینس" پر لنگر انداز ہوا، تو ڈاکٹر صاحب نے سید امجد علی سے جو اُن کے رفیقِ سفر تھے، فرمایا کہ یہاں سے لندن ٹرین میں چلیں گے اور راستہ میں دو تین دن پیرس میں ٹھہریں گے، چنانچہ یہ دونوں وینس سے ٹرین میں سوار ہو کر پیرس پہنچے ریلوے اسٹیشن پر انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے امراؤ سنگھ مجیٹھیا موجود تھے:

امراؤ سنگھ کا نام آیا ہے، تو جی چاہتا ہے کہ قارئین سے ان کا سرسری سا تعارف

بھی کرا دوں ——— سر سندر سنگھ مجیٹھیا پنجاب ہی کی نہیں متحدہ ہندوستان کی مشہور و نامور شخصیت تھے، امراؤ سنگھ انہی کے صاحب زادے تھے، مجیٹھیا سکھوں کا اعلےٰ خاندان[1] شمار کیا جاتا ہے، سر سندر سنگھ سے ڈاکٹر صاحب کے دیرینہ دوستانہ مراسم تھے، ان کی مستقل رہائش امرتسر میں تھی، مگر ان کے لڑکے امراؤ سنگھ نے پیرس کو اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا، امراؤ سنگھ مجیٹھیا نے ایک ہنگرین عورت سے شادی کی تھی، جس کے بطن سے ایک نہایت ہی حسین و ذہین لڑکی (امرتا شیر گل) پیدا ہوئی، یہ لڑکی بچپن ہی سے مصوری کا شوق رکھتی تھی، بڑی ہوئی تو اس فن میں بہت کچھ نام پیدا کیا، اور یورپ کے باکمال آرٹسٹوں میں اُس کا شمار ہونے لگا۔

پیرس پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب نے امراؤ سنگھ مجیٹھیا سے کہا کہ مجھے پیرس میں پہلے تو نپولین کی قبر پر جانا ہے، پھر مشہور ریسرچ اسکالر میگ نون MASSIGNON سے ملاقات کرنی ہے (میگ نون نے مسلمانوں کے "زمانہ سپین" پر تحقیقات شروع کرنے کے سبب اُن دنوں بڑی شہرت حاصل کی تھی) تیسرا کام یہ ہے کہ میں فرانس کے شہرہ آفاق فلسفی پروفیسر برگساں سے ملنا چاہتا ہوں (ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ پروفیسر برگساں کا نظریہ "واقعیت زماں" اسلامی تصور سے خاصہ قریب ہے)

نپولین کی قبر پر جانے کے لئے وقت مقرر ہوا اور پروگرام کے مطابق ڈاکٹر اقبال مرحوم اور سیّد امجد علی مشہور زمانہ فرانسیسی سپہ سالار اور حکمران نپولین بوناپارٹ کے مقبرہ پر

[1] سکھوں کے مشہور گاؤں مجیٹھا کی وجہ سے یہ خاندان مجیٹھیا کہلایا۔

گئے، امجد علی نے اس واقعہ کے متعلق جو سب سے زیادہ دلچسپ اور اہم بات سنائی وہ یہ ہے کہ نپولین کے مقبرے کو ڈاکٹر صاحب نے دیکھا، وہاں وہ دس پندرہ منٹ رہے لیکن مقبرے سے باہر نکلے، تو اُن کے چہرہ سے کسی خاص تاثر اور کیفیت کا اظہار نہیں ہوتا تھا، سیّد امجد علی کو یہ دیکھ کر حیرانی بھی ہوئی اور مایوسی بھی، چونکہ انہوں نے اِس موقع پر یہ توقع قائم کر رکھی تھی، کہ نپولین ایسے عظیم فرانسیسی سپہ سالار کی قبر پر جا کر ڈاکٹر صاحب پر وہ خاص کیفیت ضرور طاری ہو جائے گی جس کا مشاہدہ کبھی کبھی ہی ہو سکتا ہے، ڈاکٹر صاحب نہایت متانت کے ساتھ مقبرہ سے باہر آئے تو سیّد امجد علی کا یہ اشتیاق تشنۂ تکمیل رہ گیا۔

پروفیسر برگساں کے بارے میں پتہ لگا کہ وہ ان دنوں پیرس کے مضافات میں کسی گاؤں میں قیام پذیر ہیں، ڈاکٹر صاحب نے طبعی تساہل کی بنا پر وہاں جانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپسی پر برگساں سے ملیں گے اُس وقت تک شاید وہ پیرس ہی واپس آ جائیں۔

مشہور اسکالر میگ نون سے ملاقات کے وقت سیّد امجد علی، ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ موجود تھے، ڈاکٹر صاحب نے میگ نون سے دریافت کیا کہ مغرب کے مؤرخین کو اسلام سے جو تعصب و عناد ہے، وہ وقت گزرنے کے ساتھ کم ہو رہا ہے اور اسلام کی صداقت و حقیقت ان پر آشکارا اور واضح ہوتی جا رہی ہے ——— اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

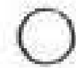
فرانسیسی عالم نے جواب دیا کہ یہ بات درست ہے کہ اب مغربی مؤرخین "نسبتاً غیر جانب دارانہ نقطۂ نگاہ سے اسلامی تحریکوں کا جائزہ لے رہے ہیں، میگ نون نے یہ

بھی کہا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ پر مسلمانوں کے عظیم احسانات ہیں۔ اُنھوں نے تہذیبی اعتبار سے یورپ کو بیدار کیا، اور تعلیم و معاشرت کے بہت سے شعبوں میں مغرب کی ترقی کے لئے نئے نئے مواقع عطا کئے ——— میگ نون سے ڈاکٹر صاحب کی ملاقات بہت دیر تک رہی، اور ان دونوں عالموں کے درمیان اہم تبادلہ خیال ہوتا رہا۔

میگ نون کے علمی ذوق اور وسعتِ معلومات کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس نے دوسری متعدد تصانیف کے علاوہ شیخ محی الدین ابن عربی صاحب خصوص الحکم کے نظریات پر ایک مبسوط و مستند کتاب لکھی۔ جس نے اُن کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ میگ نون ڈاکٹر صاحب کی باتیں بڑی دلچسپی اور انہماک سے سنتا رہا۔

۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو جب لندن میں تیسری گول میز کانفرنس ختم ہوئی، تو ڈاکٹر صاحب ہندوستان واپس آنے سے قبل پیرس تشریف لے گئے، اور فرانس کے مشہور فلسفی پروفیسر برگساں سے ملاقات کی، یہ ملاقات خاصی طویل رہی، اس میں برگساں کے نظریہ "وقعیتِ زماں" پر سیر حاصل بحث ہوئی، برگساں فلسفہ کا مجتہد تھا۔ تو اقبال بھی ان علوم کے امام تھے یوں سمجھئے کہ آئینہ آئینہ کے مقابل تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے برگساں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی "زمانہ کو بُرا مت کہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میں خود زمانہ ہوں" تو برگساں حیران و ششدر رہ گیا اور بار بار ڈاکٹر صاحب سے دریافت کرتا رہا کہ "کیا یہ صحیح قول ہے"؟



معیارِ علم

سید امجد علی نے ایک بار ڈاکٹر صاحب کے سامنے برسبیلِ گفتگو کہہ دیا کہ گرچہ علم اس زمانے میں زیادہ پھیل چکا ہے، لیکن تعلیمی اداروں میں پڑھائے جانے والے نصاب کا معیار دن بدن گرتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، موجودہ نصابِ تعلیم کے غیر معیاری ہونے کے متعلق تمہارا خیال بالکل درست ہے، لیکن جہاں تک علم کا تعلق ہے وہ پچھلے زمانے میں آج سے کہیں زیادہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ مختصر جواب بامعنی بھی ہے اور فکر انگیز بھی: علمی و فکری مسائل پر تحقیق کے طالب اگر اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں، کہ پچھلے زمانے میں علم صرف بطور "علم" اور اس زمانے میں علم بطور "ہنر و فن" حاصل کیا جاتا ہے اور عام طور پر اُس کا مقصد زندگی کی خوش حالی اور مالی ذرائع مستحکم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں سمجھا جاتا تو وہ علم حاصل کرنے کے اس نمایاں فرق کی روشنی میں ڈاکٹر صاحب کے اشارہ کا صحیح لطف اور فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اور یہ معمول "مقصد علم کے نظریہ" پر مزید تحقیق کی راہیں کھول سکے گا!

"شمع خانہ یا شمعِ محفل"

ڈاکٹر محمد اقبال اور سید امجد علی انگلستان میں مقیم تھے، ایک دن ڈاکٹر صاحب لندن کی مشہور دکان سیلف ریجس SELFRIDGES پر ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لئے گئے اور سیلز گرل سے جرابیں دکھانے کو کہا، وہ لڑکی تیزی کے ساتھ سامان لینے

کے لئے چلی گئی جب واپس آئی تو ڈاکٹر صاحب پر استغراق کی کیفیت طاری ہو چکی تھی وہ یہ تک بھول گئے کہ یہاں کیوں آئے ہیں۔ کہاں کھڑے ہیں اور لڑکی کو انہیں نے آرڈر دیا تھا سیلز گرل جب چیزیں لے کر ان کے سامنے پہنچی، تو ڈاکٹر صاحب نے اُس سے پوچھا۔

"تم یہاں کس لئے کھڑی ہو"؟

لڑکی یہ سن کر آب دیدہ ہو گئی، ڈاکٹر اقبال کی باتوں میں اسے غم خواری اور ہمدردی کی جھلک نظر آئی اور غم خوار اور ہمدرد کے سامنے ہر کوئی اپنا دُکھ درد بیان کرنے کے لئے بیتاب رہتا ہے، لڑکی بولی۔ میرے والدین کی آمدنی بہت ہی کم ہے، اس آمدنی میں وہ میری کفالت نہیں کر سکتے۔ اس لئے مجھے اپنی اور گھر کی ضروریات کے لئے نوکری کرنا پڑتی ہے۔

سید امجد علی نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اس لڑکی سے یہ سوال کیوں کیا؟

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ اس خاتون کو تو کسی گھر کی روشنی بننا تھا۔ اولاد کی صحیح تربیت کا فرض انجام دینا تھا، اس کی تخلیق کا مقصد بازار کی رونق بن کر، جرابیں فروخت کرنا تو نہیں تھا۔

مجھے ہے حکم اذاں "لا الٰہ الا اللہ"

مسجد قرطبہ کے واقعہ کو کتاب کے نقشِ اوّل میں عرض کر چکا ہوں۔ سید امجد علی نے اس واقعہ کا ذکر اس گراں قدر اضافہ کے ساتھ کیا —— کہ ڈاکٹر صاحب جب مسجد قرطبہ میں گئے، تو انہوں نے وہاں صرف نماز ادا کرنے پر اکتفا نہیں کی، بلکہ اس عظیم الشان تاریخی مسجد میں اذان بھی دی: ڈاکٹر صاحب نے یہ سارا واقعہ ایک خط میں لکھ

کر سید امجد علی کو بھیجا۔ ڈاکٹر صاحب کے خط سے ایسے جوشِ مسرت کا اظہار ہوتا تھا جیسے بچہ کوئی عجیب و نادر اور غیر متوقع چیز پا کر خوشی کے مارے وارفتہ ہو جاتا ہے!

مسجد قرطبہ مسلمانوں کے فنِ تعمیر کی جس طرح شاہکار یادگار ہے، اُس طرح عبرت کا دردانگیز مرقع بھی ہے ۱۲۳۶ء[ط] میں اس نادرالوجود مسجد کو عیسائیوں نے کلیسا میں تبدیل کر دیا، جہاں تکبیر و اذان کی روح پرور صدائیں گونجتی تھیں، وہاں کلیسا کے جرس کی اجنبی اور نامانوس آواز سنی جانے لگی، صدیوں سے یہ عبادت گاہ تکبیر و اذان سے محروم تھی۔ حکیم الامت علامہ محمد اقبال کو اللہ تعالےٰ نے یہ توفیق عطا کی کہ ۶۹۶ سال کے طویل عرصے بعد انہوں نے مسجد قرطبہ میں اذان دے کر، اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولؐ کے نام کو بلند کیا، اور تقریباً سات صدیاں گزر جانے کے بعد اندلس کی سرزمین میں اذان کی گونج نے وہاں کی فضا کو وہ گم گشتہ عظمت اور تقدیس عطا کی۔ جو تاریخ کے اوراقِ پارینہ میں محض دُھندلا عکس اور وقت کے کارواں کا غبار بن کر رہ گئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط میں یہ بھی تحریر فرمایا کہ جب انہوں نے مسجد قرطبہ میں نماز ادا کرنے کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے تو ان پر یکایک اشعار کا نزول ہونے لگا حتیٰ کہ انہوں نے پوری دُعا اشعار کی صورت میں مانگی۔ اور وہی نظم بعد میں شائع ہوئی۔

مجذوبِ فرنگی

روحانیت کے موضوع پر گفتگو فرماتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے سید امجد علی سے ایک بڑے نکتہ کی بات کہی، انہوں نے فرمایا شاعر پر بھی روحانی غلبہ کا ایک خاص دَور آتا ہے

ط SPAIN FROM THE SOUTH. By J. B. TREND. Page 70

جب یہ کیفیت شباب پر ہو، اور صحیح رہنمائی میسر نہ ہو، تو وہ بہک جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے یورپ کے عظیم شاعر نطشہ کی مثال دے کر فرمایا کہ جب جذب و وجدان نے اُس پر غلبہ کیا تو وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اُسے کوئی تربیت دینے اور راہ دکھانے والا میسر نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا شعر۔ ؎

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اُس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

اسی واقعہ کا ترجمان ہے: علامہ نے کتنی نازک حقیقت کس سادہ پیرایہ میں بیان کی ہے۔

نیشنل لیگ کا استقبالیہ!

تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے موقع پر، نیشنل لیگ آف لندن کی جانب سے ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دعوت بھی دی گئی۔ جو تاریخی اہمیت کی دعوت تھی۔ اس انجمن کی صدر ایک خاتون مس مارگریٹ فرکوہرسن تھیں، جو ممالک اسلامیہ سے دوستانہ روابط و مراسم قائم رکھنے اور انہیں مستحکم بنانے میں شہرت رکھتی تھیں، اس دعوت میں گول میز کانفرنس کے بہت سے مندوبین شریک ہوئے، جن میں مولانا شوکت علی اور سید امجد علی بھی شامل تھے۔ انگریز مہمان بھی مدعو کیے گئے تھے، اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے ایک مختصر مگر جامع تقریر کی جس میں انہوں نے ہندوستان کے سیاسی مستقبل اور گول میز کانفرنس کی کامیابی کے امکانات کا ذکر کرتے ہوئے ایک نہایت ہی دلچسپ اور مدبرانہ بات کہی۔



نیشنل لیگ لندن کی استقبالیہ دعوت میں علامہ اقبال، سید امجد علی، لیڈی سائمن اور دیگر معزز مہمان

"ہندوستان برطانیہ پر اسی صورت میں اعتماد کر سکتا ہے
جب برطانیہ بھی ہندوستان پر اعتماد کا اظہار کرے۔"

اُن کا اصل انگریزی فقرہ یہ تھا ——

" IF BRITAIN TRUSTED INDIA
SHE WOULD TRUST BRITAIN "

اس یادگار دعوت کے اختتام پر ایک گروپ فوٹو بھی کھینچا گیا، یہ فوٹو اس کتاب میں شائع کیا گیا ہے جس کی حیثیت ایک تاریخی مرقع کی ہے۔



جان برائٹ اور ڈاکٹر اقبال

تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے واقعات کا اعادہ کرتے ہوئے سید امجد علی ایک نہایت ہی دلچسپ اور قابلِ ذکر واقعہ کا انکشاف کرتے ہیں؛ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور سید امجد علی پیرس سے بذریعہ ٹرین لندن پہنچے، تو ریلوے اسٹیشن پر ایک نومسلم انگریز KHALID SHELDRAKE ڈاکٹر صاحب کو خوش آمدید کہنے کے لئے موجود تھا۔ خالد شیلڈرک نے اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کو مشہور برطانوی سیاست دان جان برائٹ JOHN BRIGHT کی تقریروں کا مجموعہ

دیا، اور عرض کیا کہ آپ کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے اہم سیاسی مباحث میں حصہ لینا ہے اس لئے میری درخواست ہے کہ ان تقریروں کو آپ جیسے بھی ممکن ہو، وقت نکال کر ضرور پڑھ لیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اُسی رات اس کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا اور رات کے دو بجے کتاب کو ختم کر کے دم لیا!

اس واقعہ کا سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں، ہندوستان کے سیاسی مستقبل پر جب ڈاکٹر صاحب نے تقریر فرمائی، تو جان برائٹ کے خیالات کی جھلک اور تاثر ان کی تقریر میں موجود تھا۔ بلکہ ڈاکٹر صاحب نے بعض مقامات پر جان برائٹ کے نظریات اپنے مؤقف کی تائید میں پیش کئے۔

اس انگریز کی فراست اور دُور بینی کا کمال دیکھئے کہ اُس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ایک سال بعد برطانوی حکومت کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ہندوستان چھوڑنے سے قبل اُسے کم از کم پانچ خود مختار یونٹوں میں تقسیم کرنے کا اہتمام کرے۔

رائٹ آنریبل جان برائٹ ممبر پارلیمنٹ نے دارالعوام میں ۲۴ جون ۱۸۵۸ء کو ہندوستان کے متعلق پبلک پالیسی کے موضوع پر جو تقریر کی تھی، اس کا ایک اہم اقتباس یہاں پیش کیا جا رہا ہے ——



SPEECH DELIVERED BY

RIGHT HON. JOHN BRIGHT, M.P.

in House of COMMONS on 24th June, 1858, on Public Policy relating to India.

PAGE ... 26 & 28

I would propose that, instead of having a Governor-General and an Indian Empire, we should have neither the one nor the other. I would propose that we should have presidencies............I would propose to have at least five Presidencies in India and I would have the governments of those Presidencies perfectly equal in rank and in salary. The capitals of those Presidencies would probably be Calcutta, Madras, Bombay, Agra and Lahore. I would have its finance, its taxation, its justice and its Police Department as well as its works and military departments, precisely the same as if it were a State having no connection with any other part of India and recognized only as a dependency of this country. If at any future period the sovereignty of England should be withdrawn, we should leave so many Presidencies built up and firmly compacted together, each able to support its own independence and its own Government................

SPEECHES BY

The Rt. HON. JOHN BRIGHT M.P.

EDITED BY

JAMES E. THOROLD ROGERS.

Published in 1892

MACMILLAN & Co. LONDON & NEW YORK

(اردو ترجمہ)

میری تجویز یہ ہے کہ ایک سلطنتِ ہند اور اس کے لئے ایک گورنر جنرل مقرر کرنے کی بجائے ہم نہ پہلی صورت اختیار کریں نہ دوسری (دونوں سے دستکش ہو جائیں) بلکہ میں یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ہم سلطنت قائم کرنے کی بجائے ہندوستان میں صوبے یا یونٹ قائم کریں۔ ....

میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں کم از کم پانچ صوبے یا احاطے قائم کئے جائیں اور اُن کی حکومتیں مرتبے اور مالی ذرائع کے اعتبار سے بالکل مساوی ہوں میرا نقطۂ نظر ہے کہ ان یونٹوں کے دار الحکومت کلکتہ، مدراس، بمبئی، آگرہ اور لاہور ہوں میری خواہش ہے کہ ہر یونٹ کا محکمۂ مالیات، محکمۂ وصولیٔ ٹیکس، محکمۂ انصاف، پولیس، امورِ رفاہِ عامہ اور محکمۂ فوج ایک دوسرے سے علیحدہ ہو، گویا ہر علاقہ ایک بالکل خود مختار اسٹیٹ (ریاست) ہو جس کا ہندوستان کے دوسرے حصّوں (صوبوں) سے کوئی تعلق نہیں ہو۔ بلکہ ہر یونٹ کو اس ملک (انگلستان) کا صرف ایک تابع ——— (DEPENDENCY) تسلیم کیا جائے۔ اگر آئندہ کبھی انگلستان کو اپنے اقتدار اعلیٰ سے دست بردار ہونا پڑے تو ہم ایک ملک کی بجائے اُن خود مختار یونٹوں سے دست بردار ہوں جن میں سے ہر علاقہ اپنی آزادی اور اپنی حکومت کو قائم رکھ سکے ......"

(ماخوذ از "مجموعۂ تقاریر جان برائٹ مرتبہ جے۔ ای۔ ٹی راجرس مطبوعہ میکملن اینڈ کمپنی لندن ۱۸۹۲ء عیسوی)



انگلستان میں منعقد ہونے والی تیسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے والے مسلم مندوبین کی ایک یادگار تصویر

ڈاکٹر شفاعت احمد خان، حافظ ہدایت حسین، ڈاکٹر سر محمد اقبال، ایچ۔ ایچ آغا خان، چوہدری ظفر اللہ خان، اے ایچ غزنوی اور سید امجد علی

پسندیدہ شاعر

ایک بار سید امجد علی نے ڈاکٹر صاحب سے یہ دلچسپ سوال کیا، کہ آپ کی نظر میں سب سے اچھا شاعر کون ہے؛

فوراً جواب دیا :-

رُومی :- تخیل میں

بیدل :- انداز بیان میں

پسندیدہ شعر

سید امجد علی نے ایک بار ڈاکٹر صاحب کو شگفتہ خاطر دیکھ کر سوال کیا کہ آپ کو کون سا شعر سب سے زیادہ پسند ہے، فرمایا' عرفی کا شعر۔

سایہ من، ہمچو من در طلب ہستی اُفتت

سایہ تو در عدم پیغمبرِ ہمت ائے من

(قصائد عرفی میں یہ شعر نعتِ رسولؐ میں موجود ہے۔)

ساتھ ہی اپنی پسندیدگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ اس شعر میں خوبصورت تعلّی موجود ہے۔

فرق

تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے بحری جہاز سے لندن جاتے ہوئے ہندوستان کا مشہور ماہر طبیعیات سر سی۔ وی رامن بھی ڈاکٹر صاحب اور سید امجد علی کا ہم سفر و ہم سفینہ تھا۔ یہ شخص بڑا تیز طرار اور باتیں کرنے میں بڑا مشتاق تھا۔ دنیا بھر کا سفر کرتا رہتا تھا۔ اس لئے جہاں دیدہ ہونے کے علاوہ خاصا مشہور بھی تھا۔ سید امجد علی کو دوران سفر اس نے اپنی شہرت کامیابیوں اور مشاہدات کا افسانہ رنگین خوب مزے لے لے کر سنایا۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور کا ذکر بھی آیا کہ

"وہ بیٹھا مشرق میں ہے مگر اُس کی شہرت مغرب میں پہنچ چکی ہے"

سید امجد علی ان باتوں سے بڑے متاثر ہوئے، اور بالآخر ڈاکٹر صاحب کے پاس آ کر اپنے یہ احساسات ظاہر کر ہی دیئے کہ اگر آپ یہ گوشہ نشینی ترک کر کے دنیا کے ممالک کا سیر و سفر کیا کریں تو آپ بھی رابندر ناتھ ٹیگور کی طرح عالمگیر شہرت اور مقبولیت حاصل کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اس سارے جوش عقیدت کا ایسا ٹھوس اور قطعی جواب دیا۔ جیسے یہ سوال بہت پہلے سے اُن کے علم میں تھا۔ اُنہوں نے فرمایا:۔

"TAGORE PREACHES REST PRACTISES ACTION,
IQBAL PRACTISES REST PREACHES ACTION."

شامِ غریباں

علامہ محمد اقبال مرحوم اور دکن کے مشہور علم دوست وزیر اعظم مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت کے مابین بڑے پُر خلوص مراسم تھے اور آپس میں خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ ایک بار ڈاکٹر صاحب حیدر آباد دکن تشریف لے گئے، اور مہاراجہ کشن پرشاد کے یہاں قیام فرمایا۔ مہاراجہ بہادر نے ڈاکٹر صاحب کی میزبانی اپنی حیثیت کے مطابق امیرانہ انداز میں کی مہاراجہ بہادر یوں بھی بڑے عالی ظرف انسان اور مہمان نواز تھے، پھر ڈاکٹر اقبال جیسا مہمان انہیں قسمت سے میسر آیا تھا۔

ایک دن ایک صاحب پرانی وضع کا انگرکھا، مغلئی پاجامہ اور دو پلی ٹوپی پہنے اکے پر بیٹھ کر ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لائے، علیک سلیک کے بعد مصافحہ ہوا، اور ان کی گفتگو سے پتہ چلا کہ یہ صاحب مغلیہ خاندان کے شہزادے ہیں اور برسوں سے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا اشتیاق رکھتے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا، کہ آپ تو حکومت دکن کے وزیر اعظم کے قصر میں فروکش ہیں، میں غریب آدمی ہوں، یہ ٹھاٹھ باٹھ کہاں سے لا سکتا ہوں، تاہم میری دلی تمنا ہے کہ ایک وقت کا کھانا میرے غریب خانے پر بھی تناول فرمائیں تو میرے لئے بڑی سعادت کا باعث ہوگا۔ آپ کے لئے اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کروں گا۔

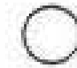
ڈاکٹر صاحب نے دعوت قبول کر لی، اور وہ مقررہ تاریخ اور وقت پر مغل شہزادے کے یہاں پہنچے۔ وہ صاحب اپنے مکان کے دروازے پر تکیہ و تنہا ڈاکٹر صاحب کے خیر مقدم کے لئے کھڑے تھے۔ اُن کے خلوص و محبت کا یہ عالم تھا جیسے انہوں نے سچ مچ ڈاکٹر صاحب کی

راہ میں آنکھیں بچھا دی ہیں، ڈاکٹر صاحب سواری سے اترے تو مغل شہزادے نے ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ تھام لیا۔ اور خاص انداز میں، ذوق کا یہ مشہور شعر پڑھا۔ ؎

دیکھا دمِ نزع دل آرام کو
عید ہوئی ذوق وے شام کو

یہ شعر مغلیہ شاہزادے کی زبان سے ادا ہوا تھا، اُس شاہزادے کی زبان سے جس کے اسلاف یہاں کے حکمران تھے، اور حکمران بھی کس دبدبہ اور شان و شوکت کے حکمران، مگر اب وہ بساط اُلٹ چکی تھی، تاریخ کے صفحات پر عبرت کے نقوش ثبت ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی نگاہوں کے سامنے یہ شعر سُن کر مغلیہ دور کی تاریخ مجسم ہو گئی۔

ان کا میزبان اس خاندان کا ایک غریب
اور فلاکت زدہ شاہزادہ تھا، ڈاکٹر صاحب پر
رقت طاری ہو گئی اور ان کی آنکھوں سے آنسو
رواں ہو گئے۔



سیاست بغیر تعلیم

سر سید احمد خان کے نامور پوتے سر راس مسعود مرحوم کی بیگم جو اب نواب زادہ راحت سعید چھتاری کی رفیقۂ حیات ہیں۔ اور کراچی میں مستقلاً اقامت پذیر ہیں، ایسی روشن خیال خاتون ہیں جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کی میزبانی اور ان سے متعدد علمی سماجی موضوعات پر ہم کلام ہونے کی سعادت حاصل کی ہے، عزیزی راحت سعید فوجی ملازمت کے دوران میرے رفیق کار رہے ہیں ان کے دیرینہ خلوص اور بیگم صاحبہ کے گراں قدر تعاون کی بدولت ڈاکٹر صاحب کے قیام بھوپال کے ایسے اہم واقعات و کوائف کا قلمبند کرنا ممکن ہو گیا، جن کے ضائع ہو جانے کا بڑا خدشہ تھا۔

چونکہ سر راس مسعود ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے اس لئے ڈاکٹر محمد اقبال کے وہ مداحوں میں تھے اور ان کی ذات سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، مگر ڈاکٹر صاحب سے ان کی دوستی کا آغاز غالباً حیدر آباد دکن سے ہوا، ڈاکٹر صاحب جب علی گڑھ تشریف لے گئے۔ تو سر راس مسعود سے تفصیلی ملاقات ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے انہیں مسلم لیگ کی صدارت قبول کرنے کا مشورہ دیا اور یہ بھی کہا کہ مسلمانان ہند کی سیاسی بیداری اور تنظیم کے لئے اپنی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو وقف کر دیں۔

قائد اعظم محمد علی جناح ان دنوں لندن میں قیام پذیر تھے، اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ایک طرف تو انگریز اپنی حاکمیت کو برقرار رکھنے کے لئے ڈپلومیسی کے تمام ہتھکنڈے استعمال کر رہے تھے، دوسری طرف ہندو اکثریت اپنی شاطرانہ چالیں چل رہی تھی مسلمان سیاست کی

چکی کے ان دو پاٹوں کے درمیان پسے جا رہے تھے ان دوہری چالوں کا مقابلہ کرنے کیلئے ایک مضبوط سیاسی تنظیم اور صحیح قیادت کی ضرورت تھی۔

سر راس مسعود نے ڈاکٹر صاحب کے اس مشورہ کو سن کر نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ میں "فروغ تعلیم کے اعلیٰ مقصد کو بہت عزیز رکھتا ہوں اور اس کی خدمت کرنا چاہتا ہوں میرے خیال میں کسی ملک میں تعلیم کے بغیر سیاسی سرگرمیاں بڑے خطرناک انجام سے دوچار ہو سکتی ہیں سیاست کے ساتھ ساتھ علم و شعور ضروری ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے سر راس مسعود کے اس خیال اور جذبہ کو بہت پسند فرمایا، اور ان کے انتخاب کو سراہا۔

بھوپال میں

سر راس مسعود مرحوم ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۷ء تک ریاست بھوپال میں اقامت گزیں رہے، اس دوران میں نہ صرف یہ کہ ڈاکٹر صاحب سے اُن کی خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا، بلکہ ڈاکٹر صاحب کئی بار بھوپال تشریف لے گئے، اور سر راس مسعود کے یہاں قیام فرمایا، ڈاکٹر صاحب کا قیام کبھی "شیش محل" میں ہوتا اور کبھی "ریاض منزل" میں اس قیام کے دوران انہوں نے کئی معرکہ آرا نظمیں کہیں راس مسعود کے یہاں ڈاکٹر صاحب کا قیام خاصہ طویل بھی ہو جاتا، وہ جب کبھی لاہور میں رہتے رہتے اکتا جاتے، تو سر راس مسعود کو لکھتے کہ ان دنوں روحانی اور جسمانی سکون کی تلاش میں ہوں! سر راس مسعود ڈاکٹر صاحب کے مزاج شناس بھی تھے وہ ان کے لکھنے کا یہ مفہوم لیتے کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت بھوپال آنے

کو چاہتی ہے! سر راس مسعود انہیں لکھتے کہ آپ بھوپال تشریف لا کر غریب خانہ کو رونق بخشیں تو دو مانوس روحیں اور تشنا سا دل یک جا ہو جائیں گے، ڈاکٹر صاحب اس کے جواب میں اپنی آمد کی تاریخ سے سر راس مسعود کو مطلع فرماتے۔

بھوپال میں ڈاکٹر صاحب کا زیادہ تر وقت سر راس مسعود کے ساتھ مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال میں گزرتا بیگم راس مسعود بھی اس گفتگو میں حصہ لیتیں، ڈاکٹر صاحب کو اکثر اوقات مغموم اور فکر مند پایا گیا، اور یہ غم اور فکر اپنے لئے نہیں قوم کے لئے ہوتی تھی۔ بڑے ہی پُرسوز لہجہ میں اکثر و بیشتر ڈاکٹر صاحب یہ فقرہ دُہراتے۔

"قوم کا تاریک مستقبل خود اپنی ہی غلطیوں سے ایک مستقل حقیقت بنتا جاتا ہے، اور افراد کی بے حسی دیکھ کر میری مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب بسا اوقات رات کو دیر تک کوٹھی کے شہ نشین پر تنہا بیٹھے رہتے اور زار و قطار روتے رہتے، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُن کے اندر سوزِ غم کی بھٹی سلگ رہی ہے جو انہیں چین سے نہیں رہنے دیتی، ڈاکٹر جانسن جن کا ذکر اس کتاب میں پڑھنے والوں کو ملے گا، بھوپال ہی میں آکر ڈاکٹر صاحب سے ملے اور بہت سے مسائل پر تبادلہ خیال کیا۔

ڈاکٹر محمد اقبال اور راس مسعود کے دوستانہ روابط وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور مضبوط تر ہوتے چلے گئے، ڈاکٹر صاحب کی علالت نے جب طول کھینچا، تو سر راس مسعود نے اُن کے علاج معالجہ کا بھوپال ہی میں معقول انتظام کیا، ان دنوں ڈاکٹر صاحب کے گلے کی تکلیف بڑھ چکی تھی، اور اُن کی آواز اتنی نحیف اور مدھم ہو چکی تھی کہ دوسروں کی سماعت تک بڑی مشکل اور دشواری سے پہنچتی تھی۔

سر راس مسعود کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی، تو ڈاکٹر صاحب سے کہا گیا کہ آپ اس نومولود کا نام رکھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے "نادرہ مسعود" نام تجویز کیا اور اسی نام کو سب نے پسند کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے لڑکے کا نام "جاوید" اپنی لڑکی کا نام "منیرہ" اور راس مسعود کی صاحب زادی کا نام نادرہ رکھا۔ ان ناموں میں کتنی پاکیزگی، شعریت اور ندرت پائی جاتی ہے۔

لیڈی راس مسعود جو شعر و ادب کا نہایت ہی پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں، ڈاکٹر صاحب کی تیمارداری اور دیکھ بھال میں ہر وقت مصروف رہتیں، راس مسعود اور اُن کی بیگم دونوں میاں بیوی ڈاکٹر صاحب کے نہ صرف یہ کہ قدر شناس تھے، بلکہ ان کی ذات سے عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔

لیڈی مسعود اُن گزرے ہوئے واقعات کا ذکر فرماتی ہیں، تو ڈاکٹر صاحب کے اس فقرے کو اکثر دُہراتی ہیں۔

انگریز نے اپنی سلطنت کی بنیاد مسلمانوں کی ہڈیوں پر رکھی ہے۔

دل و دماغ

ڈاکٹر صاحب سر راس مسعود کے بارے میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ان کا دماغ انگریز کا اور دل سچے مسلمان کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مختلف موقعوں پر اس جملہ کو دہرایا۔ ایک بار سر راس مسعود نے اس کے جواب میں فرمایا۔

"اقبال! غنیمت ہے کہ میرا دماغ مسلمان کا اور
دل انگریز کا نہیں ہے۔"

شعر کا مفہوم

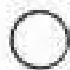
ڈاکٹر صاحب کی شہرہ آفاق کتاب "بال جبریل" جب منظر عام پر آئی، تو انہوں نے سر راس مسعود کو ایک جلد پیش کی اور کتاب پر اپنے دستخط ثبت فرما دیئے۔ بیگم مسعود اُس وقت موجود تھیں، انہوں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کا کلام ان سے بہتر میں سمجھتی ہوں
اور کتاب آپ ان کو عنایت فرما رہے ہیں"

ڈاکٹر صاحب اس فقرے سے بہت محظوظ ہوئے، اور دونوں کو مخاطب کر کے کہا کہ میں اپنا شعر سناتا ہوں، تم میں سے جو کوئی اس کی زیادہ صحیح اور بہتر تشریح کرے گا۔ وہی اس کتاب کا مستحق قرار پائے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنا یہ شعر پڑھا ؎

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محراب مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا

سر راس مسعود اور اُن کی بیگم صاحبہ دونوں نے اپنے اپنے الفاظ میں اس شعر کا مفہوم بیان کیا، لیکن وقت کی بات کہ بیگم راس مسعود کی شرح و ترجمانی زیادہ بہتر اور شاعر کے مافی الضمیر سے قریب تر نکلی، چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے "بال جبریل" کے سرورق پر راس مسعود کا لکھا ہوا نام کاٹ کر "بیگم راس مسعود" لکھ دیا اور کتاب اُن کو دے دی۔



محبّت کی شادی

بیگم راس مسعود اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان اس موضوع پر بحث چل نکلی کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح و شادی کے دائرے میں آنے سے قبل، فریقین کے مابین محبت و اُنس کی کسی نہ کسی حد تک جھلک اور آمیزش ضرور ہونی چاہئے؛ ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر فرمایا۔

"شادی کا بنیادی مقصد صالح، توانا اور خوش شکل
اولاد پیدا کرنا ہے۔ اور رُومان کا اس میں دخل نہیں
ہونا چاہیئے۔"

بیگم راس مسعود نے کہا، آج کل والدین لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے اپنی پسند اور مرضی سے رشتوں کا جس طرح انتخاب کرتے ہیں۔ اُس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟
ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا عموماً ان تمام ضروری باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر ہی رشتے طے کرتے ہیں۔

سر راس مسعود کی اقبال شناسی

افغانستان کی سیاحت میں علامہ سید سلیمان ندوی کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے تیسرے رفیقِ سفر اور مونسِ راہ راس مسعود ہی تھے، ڈاکٹر صاحب کی شاعری سے سر راس مسعود کو کس قدر لگاؤ، شغف بلکہ عشق تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے

ایک بار ڈاکٹر صاحب اور سر راس مسعود ایک محفل میں جمع تھے، راس مسعود کی طبیعت کو جو چُہل سوجھی تو وہ ڈاکٹر صاحب سے بولے کہ آج ہم دونوں کے درمیان بیت بازی کا مقابلہ رہے گا مگر اس شرط کے ساتھ کہ آج ہم اشعار شاعر مشرق ہی کے سنائیں گے، کسی دوسرے شاعر کے اشعار قبول نہیں کئے جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے عزیز دوست کی فرمائش اور شرط کو مان لیا۔ رات کے آٹھ بجے کے قریب بیت بازی کا مقابلہ شروع ہوا، اور دس بجے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ شروع شروع میں تو ڈاکٹر صاحب نے بڑی تیزی کے ساتھ اپنے اشعار سنائے، مثلاً سر راس مسعود کا کہا ہوا شعر "ل" پر ٹوٹا، اور ڈاکٹر صاحب نے فوراً اپنا ایسا شعر سنا دیا جس کی ابتداء "ل" سے ہوتی تھی، مگر رفتہ رفتہ ڈاکٹر صاحب کے شعر سنانے کی رفتار دھیمی پڑتی چلی گئی، یہاں تک کہ آخر میں ڈاکٹر صاحب کو اپنے شعر یاد کرنے میں بڑی تلاش اور غور و فکر سے کام لینا پڑا۔ مگر سر راس مسعود کے حافظہ اور یادداشت کا یہ عالم تھا کہ وہ پوری روانی کے ساتھ علامہ اقبال کے اشعار سنائے جاتے تھے اور کسی طرح ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھے آخر کار ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ اپنے دوست سر راس مسعود کے حق ہی میں دیا، اور اس بات کا اعتراف کیا کہ انہیں اپنے اشعار اتنے یاد نہیں ہیں جتنے راس مسعود کو یاد ہیں۔ اور وہ (اقبال) اُن (راس مسعود) کی حاضر جوابی، برجستہ گوئی اور اقبال شناسی کے آگے سپر انداختہ ہیں

؎ بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است

الہامی شاعری

ڈاکٹر اقبال کی شعر گوئی کے بارے میں اسی کتاب میں اجمالاً کچھ عرض کر چکا ہوں

ڈاکٹر صاحب اس وقت شعر کہتے جب اُن پر خاص کیفیت طاری ہوتی، یہی سبب تھا کہ اُن کے وارداتِ قلبی کسی زحمت و تکلف کے بغیر اشعار کے قالب میں ڈھلتے چلے جاتے وہ جو فرمایا گیا ہے ؎

شاعری جزویست از پیغمبری

تو اقبال کی شاعری اس مصرعہ کا صحیح مصداق ہے۔

ٹھیک یہی رائے بیگم راس مسعود کی بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اُن کے یہاں طویل قیام فرماتے۔ بیگم صاحبہ اُن کی میزبانی اور خاطر و مدارات میں لگی رہتیں، ڈاکٹر صاحب کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا اور اُن کی عادات، مشاغل اور رجحانات کے مطالعہ کے مواقع انہیں میسّر آتے رہے۔

بیگم راس مسعود فرماتی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی شعر گوئی کی کیفیت و حالت کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کے وجدان پر الہام کی بارش ہو رہی ہے۔ جب ایسا وقت آتا تو ڈاکٹر صاحب خلوت و تنہائی کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس فرماتے۔ وہ ایسے میں کسی کو اپنے پاس بٹھانا پسند نہ کرتے، یہاں تک کہ اپنے عزیز ترین دوست سے بھی بلا تکلف کہہ دیتے کہ بھائی اس وقت تو میں تنہائی چاہتا ہوں، ہاں کل کسی وقت آنا، پھر فرصت سے بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔ دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر صاحب کے تکیہ کے نیچے سے جو کاغذ برآمد ہوتا، وہ تازہ ترین شعروں سے مزیّن ہوتا۔



لطیفہ گو مصاحب

ڈاکٹر صاحب کے تمام اعزا، دوست، احباب اور شناسا اُن کی علالت کے لامتناہی سلسلے کے سبب انتہائی فکرمند مغموم اور کبیدہ خاطر تھے۔ چنانچہ ایک بار سر راس مسعود نے بھوپال میں اُن کے علاج کا معقول انتظام کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو اس علالت کے عالم میں سفر کرنا دشوار تھا، مگر سر راس مسعود کی بات کو وہ ٹال نہ سکے، انہوں نے راس مسعود کے پہلے خط ہی پر بھوپال جانے کی ہامی بھر لی — ڈاکٹر صاحب کا بیماری کی حالت میں بھوپال تشریف لے جانا، اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں سر سید احمد خاں کے خاندان سے کس قدر محبت اور لگاؤ تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطوں میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے کہ سر راس مسعود کے یہاں رہ کر انہیں کس قدر ذہنی سکون اور قلبی آرام میسر آتا تھا۔ ایک بار ڈاکٹر صاحب بھوپال میں مقیم تھے، اُن کے میزبان بڑی دلجوئی، محبت بلکہ عقیدت کے ساتھ میزبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ لیڈی راس مسعود کے والد کرنل عبد المجید خاں ان دنوں ریاست اندور میں تھے، انہوں نے اپنے ایک مصاحب کو ڈاکٹر صاحب کی دلبستگی اور دلجوئی کیلئے بھوپال بھیج دیا۔ اس شخص کا نام عبد الحکیم تھا مگر وہ اپنی ظرافتِ طبع اور بذلہ سنجی کے سبب "چُرکی" کے لقب سے مشہور تھا۔ "عبد الحکیم عرف "چُرکی" لوگوں کا بڑا مزاج شناس تھا جیسی محفل ہوتی اُسی کی مناسبت سے لطیفے بیان کرتا اور طرح طرح کے شگوفے چھوڑتا، سیاسی شگوفے نہیں، ڈاکٹر صاحب اس شخص سے خاصے مانوس ہو گئے۔ اُس کے لطیفوں اور

چٹکلوں سے بہت محظوظ ہوتے۔ جب ڈاکٹر صاحب بھوپال سے رخصت ہونے لگے، تو انہوں نے "چڑکی" کی تعریف کی۔ چڑکی بھی خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا کہ مجھے اتنی عظیم شخصیت کی رفاقت کی سعادت میسر آئی!

ڈاکٹر صاحب کے انتقال کی خبر جب "چڑکی" نے سُنی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جیسے اُس کے کسی ہمدرد اور کرم فرما بزرگ کی وفات کا سانحہ پیش آگیا ہے، اُس غریب کے پاس جو کچھ جمع پونجی تھی، اُس کا کھانا پکوا کر ایصالِ ثواب کے لئے غریبوں میں تقسیم کیا! عبدالحکیم چڑکی کی عقیدت و محبت کے اس مظاہرہ کو دیکھ کر، ڈاکٹر صاحب کے بعض قریبی دوست تک حیران رہ گئے۔

شانِ استغناء

ڈاکٹر صاحب کے یوں تو بہت سے احباب تھے مگر راس مسعود کی محبت اور لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ہر وقت سوچتے رہتے۔ فکر اس بات کی کہ ڈاکٹر صاحب کی علالت طویل سے طویل تر ہوتی چلی جا رہی ہے، اُن کے مالی حالات بھی اچھے نہیں ہیں! آخر کار ڈاکٹر صاحب کے حالات پر بہت کچھ غور کرنے کے بعد نواب سر حمید اللہ خان فرمانروائے بھوپال اور سر آغا خان سے سلسلہ جنبانی کی اور بڑے عزت و وقار کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے معاملہ کو پیش کیا۔ سر راس مسعود خود اپنی جگہ ممتاز شخصیت رکھتے تھے۔ پھر جو شخصیت موضوعِ فکر و گفتگو تھی، وہ سب کے نزدیک محترم اور قابلِ عزت و تکریم تھی، چنانچہ انہوں نے نواب صاحب بھوپال اور سر آغا خاں کو پانچ پانچ سو روپے ماہوار

کے وظائف کے لئے آمادہ کر لیا! جب یہ معاملہ طے پا گیا، تو سر راس مسعود نے جو اُس وقت بھوپال کے وزیر تعلیم بھی تھے، ڈاکٹر صاحب کو اس واقعہ کی اطلاع دی! اور انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے التجا کی کہ میں نے آپ کے ایماء کے بغیر یہ کوشش کی ہے آپ اس پیشکش کو قبول فرمالیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی قانونی پریکٹس عرصہ سے موقوف تھی! بیماری کے تسلسل نے اُن کے مالی حالات کو بُری طرح متاثر کیا تھا، اُن کی ضروریات وسیع بھی تھیں۔ اور ناگزیر بھی، ایسے عالم میں ایک ہزار روپیہ ماہوار کی آمدنی کی سبیل کتنی بڑی چیز تھی! مگر ڈاکٹر صاحب قلندر صفت اور درویش مزاج واقع ہوئے تھے وہ بڑے عالی ظرف اور طبعیت کے مستغنی تھے، انہوں نے سر راس مسعود کا یہ مشورہ تو قبول کر لیا! اور ان کی بات مان لی، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ میری موجودہ ضروریات کے لحاظ سے پانسو روپیہ ماہوار مجھے بہت کافی ہیں، اس سے زیادہ خرچ کی مجھے عادت نہیں اس لئے نواب صاحب بھوپال کے وظیفہ پر اکتفا کی جائے اور سر آغا خاں سے وظیفہ نہ لیا جائے

سر راس مسعود نے ڈاکٹر اقبال کے اس جواب اور اُن کی قناعت پسند روش کو بہت سراہا، لیکن ساتھ ہی اس امر کے لئے کوشاں ہوئے، کہ سر آغا خاں والے وظیفہ کی رقم ماہ بماہ کسی بنک میں جمع ہوتی رہے، اور ڈاکٹر صاحب کے دونوں بچوں جاوید اور منیرہ کی تعلیم و تربیت میں دشواری پیش آنے پر ایک ٹرسٹ کی نگرانی میں اسے صرف کیا جائے، یہ اقدام بڑی دُور اندیشی پر مبنی تھا! لیکن قدرت کا فیصلہ کون بدل سکتا ہے! چنانچہ اس سے قبل کہ اس مقصد کے لئے باقاعدہ ٹرسٹ قائم کیا جاتا، یا سر آغا خاں وظیفہ کی ادائیگی شروع

کرتے، سرراس مسعود ڈاکٹر صاحب کی زندگی ہی میں "رفیقِ اعلیٰ" سے جا ملے، اور یہ بساط ہی اُلٹ گئی۔

نادرہ مسعود

سرراس مسعود سے، ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کا تعلقِ خاطر اور اخلاص کسی دلیل اور تشریح کا محتاج نہیں ہے، ڈاکٹر صاحب اپنے عزیز دوست کے لئے اپنے دل میں جس قدر محبت آمیز جذبات رکھتے تھے، اس طرح سرراس مسعود کی بیگم بھی انہیں عزیز تھیں۔ اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کی صاحب زادی نادرہ مسعود کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر صاحب بھوپال تشریف لے گئے۔ اور حسبِ معمول اپنے دوست راس مسعود کے یہاں قیام فرمایا۔ مرحوم ان دنوں بھوپال اسٹیٹ میں وزیرِ تعلیم تھے، بیگم راس مسعود کی صحت کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب فکرمند ہوئے انہوں نے ہدایت کی کہ بیگم صاحبہ روزانہ صبح سویرے باغ میں چہل قدمی کیا کریں، باغ کی روشوں اور سبزے پر ٹہلیں، تازہ اور خوش رنگ پھولوں سے لطف اندوز ہوں، ساتھ ہی کسی خوش الحان قاری کا انتظام کیا جائے، جو بیگم صاحبہ کو اس گل گشت کے بعد انہیں سورۂ رحمٰن سنایا کرے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس ہدایت اور مشورہ کے بعد خوش الحان قاری کی تلاش شروع ہوئی متعدد قاری صاحبان آئے، اُن کی قرأت سنی گئی، آخرکار ایک قاری کا انتخاب خود ڈاکٹر صاحب نے کیا۔

بیگم راس مسعود اس واقعہ کی حرف بہ حرف تصدیق کرتے ہوئے فرماتی

ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی اس ہدایت پر پورا پورا عمل کیا گیا، میں ہر روز علی الصبح باغ میں ٹہلنے کے لئے جاتی اور ایک نہایت ہی خوش الحان قاری مجھے سورۂ رحمٰن سناتے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سورج طلوع بھی نہ ہونے پاتا، اور میں پھول چُن کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں لے کر جاتی، پھولوں پر شبنم کے قطرے جھلملاتے ہوتے، بچی کے پیدا ہونے تک روزانہ صبح کے وقت بیگم راس مسعود کا یہی معمول رہا۔

اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب کے عزیز دوست راس مسعود اور اُن کی بیگم کو چاند سی بچی عطا کی، اس بچی کا نام ڈاکٹر صاحب نے "نادرہ" رکھا، ڈاکٹر صاحب کو یہ نام بہت پسند تھا، اُن کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی، تو ڈاکٹر صاحب نے اس کا نام بھی "نادرہ" تجویز کیا۔

ڈاکٹر صاحب کو بڑی مسرت ہوئی کہ زچہ اور بچہ دونوں اللہ تعالیٰ کے فضل سے صحت مند ہیں، اور نادرہ اُن کے عزیز دوست سرراس مسعود کے یہاں "چراغ خانہ" بن کر کتم عدم سے پردۂ وجود پر نمودار ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے "نادرہ مسعود" کی پیدائش پر تاریخی قطعہ قلم بند کرایا، یہ یکم مارچ ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے، یہ اشعار جواب سے ۲۳ سال قبل کہے گئے تھے کسی کتاب یا رسالے میں آج تک شائع نہیں ہوئے، پہلی بار اس کتاب کی زینت بنے ہیں

ان اشعار کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ سرسید احمد خاں کے پورے خاندان کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے

گھرانوں میں لڑکی کے پیدا ہونے پر جس سرد مہری اور بے دلی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، اُس کا ازالہ ڈاکٹر صاحب نے ان اشعار میں بڑے ہی حکیمانہ انداز میں فرمایا ہے۔

اِس مسعودِ جلیل القدر کو — جو کہ اہل و نسل میں مجدُود ہے
یادگارِ سیّدِ والا گُہر — نورِ چشمِ سیّد محمُود ہے
لختِ جانِ جگر دُختر ملی — شُکرِ خالق، منّتِ معبُود ہے
خانداں میں ایک لڑکی کا وجود — باعثِ برکاتِ لامحدُود ہے

کس قدر برجستہ ہے تاریخ بھی
باسعادت دُخترِ مسعُود ہے

یکم مارچ ۱۹۳۷ء — بھوپال (محمد اقبال)

اس قطعہ کا تیسرا شعر ہے

خانداں میں ایک لڑکی کا وجود — باعثِ برکاتِ لامحدُود ہے

حکیمانہ ہی نہیں مصلحانہ بھی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کا ترجمان ہے کہ حضور اپنی لختِ جگر اور سعادت مند بیٹی سیدہ فاطمۃ الزہرا کو بیحد و بے انتہا چاہتے تھے اس لیے کسی گھر میں بھی لڑکی کی پیدائش غم کی نہیں خوشی کی بات ہے بیٹے کی طرح بیٹی بھی اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔

مخلوط تعلیم

صنفِ نازک کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا یہ نظریہ تھا کہ خواتین کا کام گھروں

میں رہ کر نئی نسل کو تربیت دینا ہے کہ اس طرح معاشرے میں اعتدال و سکون قائم رہ سکتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب عورت کو "شمع انجمن" نہیں "چراغ خانہ" دیکھنا چاہتے تھے، اُن کے سامنے یورپ کی زندگی تھی کہ عورت نے وہاں جب سے گھریلو ذمہ داری، تدبیر منزل اور خانہ داری کو خیرباد کہا ہے، یورپ کا معاشرہ تباہ و ابتر ہو کر رہ گیا ہے اور گھریلو زندگیاں بے مزہ اور بے سکون ہو گئی ہیں —— ایک دن بیگم راس مسعود نے قدرے شکایت کے انداز میں ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ مرد خود تو تفریح کرنے اور دل بہلانے کے لئے رقص و سرود کی محفلوں اور کلب گھروں میں چلے جاتے ہیں، لیکن بیچاری عورتوں کو چار دیواری میں مقید رہنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے نہایت ہی متین لہجہ میں کہا، میں جو کچھ کہتا ہوں، اس میں تمام تر خواتین کا ہی فائدہ ہے۔ سفر افغانستان سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب سے مزید دریافت کیا گیا کہ جب قرآن کریم تمام انسانوں کو علم و آگہی حاصل کرنے کی ہدایت کرتا ہے، تو پھر لڑکوں اور لڑکیوں کی جدید تعلیمی سہولتوں پر کیوں قدغن لگائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا بے شک قرآن کریم میں حصولِ علم پر بڑا زور دیا گیا ہے لیکن اس میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں ایک مکتب میں مل جل کر تعلیم حاصل کریں۔

پردہ اور مخلوط تعلیم کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے خیالات بڑے واضح تھے اور وہ اپنے اس موقف سے بال برابر ہٹنا نہیں چاہتے تھے، انہوں نے خود اپنی زندگی میں اس کا عملی ثبوت دیا کہ اپنی بچی منیرہ کی تعلیم و تربیت کے لئے بڑی کوشش اور جد و جہد کے بعد



افغانستان میں قیام کے دوران کی ایک نادر تصویر
درمیان میں ڈاکٹر اقبالؒ اور اُن کے دائیں سر راس مسعود مرحوم کھڑے ہیں!

علی گڑھ سے ایک معلّمہ بُلوائی جس نے گھر ہی رہ کر ڈاکٹر صاحب کی بچی کو تعلیم دی۔

ڈاکٹر صاحب منطقی اور فلسفیانہ انداز میں مردوں اور عورتوں کو اپنے مختلف خوشرنگ اور مہکتے پھولوں سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ جن کو پروان چڑھانے کے لئے جُداگانہ اقسام کی کھاد درکار ہوتی ہے۔ وہ زن و مرد کی ترقی، نشوونما اور تعلیم و تربیت کے لئے جُداگانہ میدانِ عمل کے قائل تھے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے ان کو جسمانی طور پر بھی ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے۔ اور فرائض کے اعتبار سے بھی فولاد اور پھول کی ڈالی سے ایک جیسا کام نہیں لیا جا سکتا۔

سفرِ افغانستان

جب مخلوط تعلیم اور حجاب و بے حجابی کا ذکر چھڑ گیا ہے، تو اس ضمن میں ایک واقعہ کا بیان کرنا نہ صرف یہ کہ دلچسپی کا باعث ہو گا بلکہ اس کا ذکر نہایت ضروری ہے یہ واقعہ ڈاکٹر اقبال کے خیالات و نظریات کا آئینہ دار ہے کہ وہ صنفِ نازک کو زندگی کی منزل میں کن خطوط پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے۔ اور عورت کی عصمت و آبرو کا تحفظ ان کو کتنا عزیز تھا۔

حکومتِ افغانستان نے بعض مذہبی اور تعلیمی امور میں صلاح و مشورت کے لئے مولینا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر محمد اقبال اور سر راس مسعود کو اپنے یہاں آنے کی جب دعوت دی، تو سر راس مسعود کی شادی کو بہت تھوڑا عرصہ ہوا تھا۔ بیگم راس مسعود نے اپنے شوہر سے کہا کہ وہ اس سفر میں اُن کے ہمراہ چلنا چاہتی ہیں۔ سر راس مسعود کے لئے بیوی

خسروی شمشیر و درویشی نگہ
ہر دو گوہر از محیط لا الٰہ
فقر و شاہی واردات مصطفیٰ است!
ایں تجلی ہائے ذات مصطفیٰ است!

ایں دو قوت از وجود مومن است
ایں قیام و آں سجود مومن است
فقر سوز و درد و داغ و آرزوست!
فقر را در خوں تپیدن آبروست!

اقبال رحم

کی اس فرمائش کا ٹالنا کسی طرح ممکن نہ تھا، نئی نئی شادی ہوئی تھی، مناظر سے لبریز سفر، شاہی میزبانی، ان حالات میں شریکِ حیات سے بہتر رفیقِ سفر اور کون ہو سکتا تھا؛ مگر اس معاملہ میں سر راس مسعود نے ڈاکٹر اقبال سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا، چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو خط لکھا۔ ڈاکٹر صاحب سر راس مسعود اور بیگم مسعود دونوں کو عزیز رکھتے تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ مگر یہ گھریلو نہیں قومی معاملہ تھا۔ انہوں نے راس مسعود مرحوم کو جواب میں لکھا کہ حکومتِ افغانستان اپنے تہذیبی و تعلیمی نظام کی تکمیل و ترتیب کے لئے ہندوستان کے علماء کا جو وفد بلا رہی ہے، اس کے ہمراہ ایک بے پردہ خاتون کے جانے کا افغانستان کے حکمرانوں پر جو اثر مرتب ہوگا، وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے: بیگم صاحبہ کو رفیقِ سفر بنانے کی وجہ سے ہندوستان کے مسلم ماہرینِ تعلیم کے خیالات و نظریات پر اُن کا وہ اعتماد ہی باقی نہ رہے گا، جس اعتماد کی بنا پر اس وفد کو بلایا گیا ہے۔

بیگم راس مسعود کے لئے ڈاکٹر صاحب کا یہ جواب نہایت دل شکن تھا، مگر دونوں میاں بیوی ڈاکٹر صاحب کے مشورے کو رد بھی نہیں کر سکتے تھے، وہ جانتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب نے جو مشورہ دیا ہے، اس میں حکمت کے ساتھ ہمدردی اور بھلائی کا جذبہ بھی شریک ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مشورے کے مطابق سر راس مسعود بیگم صاحبہ کو سفر میں ہمراہ نہیں لے گئے۔

ڈاکٹر محمد اقبال کے مشورے کی پروا کئے بغیر اگر سر راس مسعود اپنی روشن خیال بیگم کو اس سفر میں ساتھ لے جاتے، تو افغانستان جیسے مذہبی اور قدامت پسند ملک میں اس وفد کی اہمیت کتنی مشکوک اور مشتبہ ہو جاتی، اور افغانستان کا مؤرخ اس وفد کے بارے میں اپنے کیا تاثرات پیش کرتا۔ یہ بات کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے۔

شعر کا مفہوم

۱۹۳۶ء میں نواب زادہ راحت سعید خاں چھتاری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ ایک روز اُن کے استاد پروفیسر آل احمد سرور سے ڈاکٹر صاحب کے اس شعر پر اُن کا اختلاف ہو گیا ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

یہ شعر "بالِ جبریل" کا سرنامہ ہے، اور مفہوم سنسکرت کے کسی شاعر بھرتری ہری سے مستعار لیا گیا ہے یا یوں سمجھئے کہ ان کے کسی دوہے یا چھند کا ترجمہ ہے۔

استاد کا زاویۂ نگاہ یہ تھا کہ مصرعہ اول استفہامیہ ہے اور اس میں اندازِ بیان یہ ہے کہ بھلا پھول کی پتی ہیرے کو کاٹ سکتی ہے، اور جب پھول کی پتی سے ہیرا نہیں کٹ سکتا، تو ناداں انسان پر نرم و نازک نصیحت کیونکر کارگر اور اثر انداز ہو سکتی ہے۔

شاگرد کا اندازِ فکر مثبت تھا، اور وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ تو ممکن ہے کہ پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹ کر رکھ دیا جائے، لیکن مردِ ناداں پر نرم و نازک بات کا اثر ہو، یہ ممکن نہیں۔

بحث خاصی طویل ہو گئی، استاد اور شاگرد دونوں اپنے اپنے موقف پر جمے ہوئے تھے۔ آخر طے پایا کہ ڈاکٹر صاحب سے شعر کا مفہوم دریافت کیا جائے۔ چنانچہ لاہور خط لکھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا۔

"ہر دو مفہوم اپنی جگہ خوب ہیں، لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اُسے آنے والا وقت بخوبی سمجھ سکے گا"

ابُوتراب

۱۹۱۳ء کی بات ہے، ڈاکٹر صاحب کی رہائش انار کلی کے مکان میں تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب فلسفہ خودی اُن کے ذہن و فکر میں جنم لے رہا تھا، مولوی میر حسن کے پوتے سید محمد عبد اللہ اُن سے ملنے کے لئے وہاں پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت شگفتہ موڈ میں بیٹھے تھے، سید صاحب نے شکوہ کے انداز میں کہا ۔ ڈاکٹر صاحب، یہ کیا بات ہے آپ اپنے اشعار شیخ عبد القادر کو تو سناتے ہیں، مگر ہمیں کبھی نہیں سناتے، اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ اچھا، کچھ نئے اشعار سنو، سید محمد عبد اللہ ہمہ تن متوجہ ہو گئے، ڈاکٹر صاحب نے پڑھنا شروع کیا ——

گفت رومی کے شود سر سبز سنگ
خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ
من نگویم پیرِ دانا خوش نگفت
سرِّ تکمیلِ حیات از ما نہفت
تا بخاکِ خود نباشی حکمراں،
گل بروید از برائے دیگراں،
طور موجے از غبارِ خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش

ڈاکٹر صاحب نے جب آخری شعر پڑھا، تو سید محمد عبد اللہ "موجے از غبار" کی ترکیب پر سوچ میں پڑ گئے، آخر ہمت کرکے اعتراض جڑ ہی دیا، بولے، ڈاکٹر صاحب، موجِ باد اور موجِ آب تو سنا تھا، لیکن موجِ غبار یا موجِ خاک کی ترکیب پہلی بار سُنی ہے ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا وہ سامنے شاہ جیؒ کی لغت رکھی ہے، اس میں ابھی دیکھے لیتے ہیں، چنانچہ لُغت دیکھی گئی موجِ خاک یا موجِ غبار کی ترکیب اس میں نہیں ملی۔

اس پر ڈاکٹر صاحب نے یہ کہتے ہوئے لُغت بند کر دی کہ میں جس مفہوم کو بیان کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے یہی الفاظ موزوں ہیں۔ دوسرے لفظوں سے میرے مفہوم کی صحیح اور واقعی ترجمانی نہیں ہو سکتی؛ سید صاحب کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اس "تاویل، توجیہ اور دلیل سے میں مطمئن نہیں ہوا اور ایک دن موقعہ پاکر سیالکوٹ میں مولوی میر حسن صاحب کے سامنے اس بحث کو چھیڑ دیا، ڈاکٹر اقبال بھی اُستاد کی خدمت میں حاضر تھے، ڈاکٹر صاحب سمجھ گئے کہ میری موجودگی میں اس جدّتِ ترکیب پر مجھے قائل کرنے کے لئے یہ بحث چھیڑی گئی ہے اس لئے انہوں نے سید محمد عبداللہ شاہ صاحب کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا یہ سید عبداللہ صاحب کہتے ہیں کہ میں اس بحث کا لطف اُٹھانا چاہتا تھا اس لئے پوری بات کہہ کر دم لیا، مولوی صاحب نے شعر سنا، تو فرمایا، اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے۔

---

۱ شمس العلماء مولوی سید میر حسن نے ایک فارسی لُغت مرتب فرمائی تھی جو ترتیب پانے کے بعد شائع بھی ہوئی ڈاکٹر صاحب کے پاس اس کا ایک نسخہ آخر تک محفوظ رہا اب یہ نسخہ جاوید اقبال اسلامیہ کالج کی لائبریری کو دے چکے ہیں۔

"طُور مشتِ از غبارِ خانہ اش"

ڈاکٹر صاحب اس پر فوراً بولے، میرا مقصد یہاں TRANSPARENCY گویا بلّور کے مانند شفاف بیان کرنا ہے جسم بتانا نہیں ہے اس اصلاح کے بعد تو جسم متعین ہو جائے گا، اس کے بعد انہوں نے سیرتِ نبوی کا وہ واقعہ بیان کیا کہ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو زمین پر مٹی پر لیٹے ہوئے دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی محبت کے ساتھ فرمایا —

"اُٹھ ابو تراب"

پھر انہوں نے سید محمد عبداللہ شاہ سے بطرزِ استفہام پوچھا کہ کیا حضور نے حضرت علیؓ سے اس طرح جو تخاطب فرمایا تھا، وہ ازرہِ مذاق و تفنّن تھا، میرے بھائی؛ اس "خطاب" میں اشارہ تھا علیؓ کے ایثارِ نفس، فقر اور قوتِ ایمانی کی طرف، جس نے انہیں اپنی خاک یعنی اپنی ذات اور جسم و جاں پر اور تمام دنیوی خواہشات پر حکمرانی بخش دی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا جس طرح "ابو تراب" کا مفہوم "خاک کا باپ" سمجھنا درست نہیں اسی طرح یہاں "موجِ از غبار" کو خاک کی تہ تصور کر لینا بھی صحیح نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ شعر ؎

طُور موجے از غبارِ خانہ اش کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش

آج بھی ان کے مجموعہ کلام "اسرارِ خودی" میں کسی تغیر و اصلاح کے بغیر موجود ہے لیکن مندرجہ بالا تین اشعار اس مثنوی میں کہیں نہیں ملتے اور اب تک غیر مطبوعہ تھے، جو پہلی بار یہاں پیش کئے گئے ہیں۔

دانہ وخرمن

ایک صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو لمبا چوڑا خط لکھا، اندازِ نگارش تبلیغی تھا، یہ کوبعض مسائل میں ڈاکٹر صاحب اُن کے ہم خیال ہو جائیں، اس خط میں دلائل بھی تھے اور منطق وفلسفہ کی آمیزش بھی، ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں مفصل خط تحریر فرمایا، اور اُن کی باتوں کا ایک ایک کرکے جواب دیا، خط کے آخر میں یہ قطعہ لکھا:-

ایک دانہ پر ہے نظر تیری — اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں

میں کسی کو برا کہوں، توبہ! — ساری دنیا سے خود بُرا ہوں میں

اندازِ بیان

سیالکوٹ میں ایک مُقرر جلسوں میں عام طور پر اس انداز سے خطاب کیا کرتے تھے۔

ہمارا علیؓ وہ علی نہیں ہے جو شیعوں کا علی ہے۔

اور

ہمارا مسیح وہ مسیح نہیں ہے جو عیسائیوں کا مسیح ہے

ڈاکٹر صاحب تک جب یہ اطلاع پہنچی، تو اس واعظ و مقرر کے اس اندازِ بیان سے نہایت کبیدہ خاطر ہوئے اور ان کی یہ کبیدگی آخر کار شعر کے قالب میں ڈھل گئی ایک

روز فرمایا۔ ؎

وہ نصاریٰ کا خدا ہے یہ ہے علی شیعوں کا

ہائے کس ڈھنگ سے اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

یہ شعر ڈاکٹر صاحب کے مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہے۔

"ہیلی ستارہ"

شاعرِ مشرق کے استاد مولوی میر حسن صاحب کے صاحب زادے ڈاکٹر علی نقی گورنمنٹ ہاؤس میں گورنر کے عملہ کے علاج معالجہ کے لئے تعینات تھے۔ جب وہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو پنجاب کے گورنر سر میلکم ہیلی نے انہیں چائے کی الوداعی دعوت دی، اس دعوت میں بہت سے معززین شریک تھے، ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم نے ڈاکٹر علی نقی کو ایک شعر لکھ کر دیا، جسے ڈاکٹر علی نقی نے نہایت خوشخط لکھوا کر اس تقریب میں گورنر کو پیش کیا، شعر یہ تھا

پنجاب کی کشتی کو دیا اس نے سہارا

تابندہ ہمیشہ رہے ہیلی کا ستارا

اس شعر میں ڈاکٹر صاحب نے یہ رعایت رکھی تھی کہ ایک مشہور سیارہ شناس کا نام بھی ہیلی ایڈمنڈ HALLEY EDMUND ہی تھا۔ اور ایک نیا ستارہ دریافت کرنے کی وجہ سے اُس نے اُن دنوں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اس نو دریافت ستارہ کا نام بھی "ہیلی سٹار" مشہور ہو گیا تھا، اس شعر سے تمام سامعین بے حد لطف اندوز

ENCYCLOPAEDIA BRITANICA (II) PAGE 162

ہوئے:

علمی مباحث

پروفیسر یُوسف سلیم چشتی سابق پرنسپل اشاعت اسلام کالج لاہور سے میری قدیم نیاز مندی ہے۔ موصوف ایک کہنہ مشق انشاپرداز، بالغ نظر ماہر تعلیم اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علامہ اقبال کی کتابوں کے شارح بھی ہیں۔ حکیم الامت کی صحبت میں حاضری کا شرف انہیں سالہا سال حاصل رہا۔ اور اس رفاقت کی نمایاں خصوصیت یہ ہے، کہ انہیں علامہ مرحوم سے خالص علمی و فلسفیانہ انداز کے ایسے مباحث کا موقع ملا، جو مجھ ایسے کم علم لوگوں کے لئے ممکن نہ تھے۔ خوش قسمتی سے ان افکار و معارف کا ایک نادر حصہ ان اوراق کی زینت بن رہا ہے۔

خرد یا عشق

پروفیسر یوسف سلیم فرماتے ہیں۔ ۱۹۱۶ء میں جب میں کانپور میں تھا، میرے نانا حاجی ریاض الدین، مرحوم، نے اسرارِ خودی کا نسخہ مجھے بھیجا۔ مرحوم کو میری ذہنی و فکری تربیت سے خاص دلچسپی تھی۔ ۱۹۱۷ء میں جب میں نے میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تو انہوں نے مجھے راڈویل کا انگریزی ترجمہ، قرآن انعام دیا تھا۔ اسرارِ خودی میرے لئے بالکل نئی کتاب تھی۔ میں اس وقت تک علامہ اقبال کے افکار سے نابلد تھا۔ اس نسخہ میں وہ دیباچہ بھی شامل نہ تھا، جو پہلے ایڈیشن میں تھا۔ اس لئے کتاب پڑھنے کو تو پڑھ لی،

مگر سمجھ میں بالکل نہ آئی؛ اس لیئے میں نے اس کتاب کو اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ اور علاّمہ سے غافل ہو گیا اس کے بعد اُن کی دو چار غزلیں البتہ بعض رسالوں میں نگاہ سے گزریں لیکن ان سے اقبالؔ کی شاعرانہ عظمت کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا۔

۱۹۲۲ء میں مشن کالج لاہور میں آیا تو یہاں مولوی محمد حسین آزادؔ کے پوتے آغا طاہر سے ملاقات ہوئی، انہوں نے پیامِ مشرق کا نسخہ مجھے عنایت کیا اُسے پڑھ کر یہ تاثر ہُوا۔ کہ اقبالؔ کوئی فلسفی ہیں، کیونکہ اس کتاب میں یورپ کے کئی نامور فلاسفروں (اسپنوزا، لاک، ہیگل، کانٹ، نطشہ اور مارکس) پر تنقید کی گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب میں فلسفۂ الٰہیات اور علم کلام کے مطالعہ میں منہمک تھا، اور یہ پڑھ چکا تھا کہ کانٹ نے ان تمام دلائل کا ابطال کر دیا ہے جو فلاسفہ نے اثباتِ واجب کے لیئے مرتب کئے تھے؛ اس لیئے مجھے خیال آیا کہ اقبالؔ لاہور ہی میں رہتے ہیں، لاؤ اُن سے معلوم کر کے دیکھوں کہ واجب الوجود کا اثبات عقلاً ممکن ہے بھی یا نہیں، میں اُن دنوں اس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا کہ اگر اثباتِ واجب پر ہم کوئی دلیل نہیں لا سکتے، تو پھر اہلِ مذہب خدا کا اثبات کس طرح کریں گے بہ الفاظ دیگر سائنس یا فلسفہ کے مقابلے میں خدا کی ہستی کس طرح ثابت ہو گی، اور اگر نہیں ہو گی، تو پھر ہمارا موقف کس طرح ثابت ہو گا؟

چنانچہ میں نے اپنے دوست ملک عبدالحمید پرشین ٹیچر رنگ محل مشن ہائی اسکول لاہور سے کہا کہ مجھے علامہ اقبال کے یہاں لے چلو؛ ملک صاحب کی علامہ سے خاصی نیازمندی تھی کہنے لگے علامہ کا دروازہ ہر شخص کے لیئے ہر وقت کھلا ہوا ہے، وقت مقرر کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ جب جی چاہے میرے ساتھ چلے چلو؛ شاید مارچ یا اپریل کا مہینہ

تھا، ہم دونوں عصر کے وقت علامہ کے یہاں پہنچے، وہ اُس زمانے میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رہتے تھے، جو قدیم طرز کی بنی ہوئی تھی۔ اب یہ کوٹھی بہت شکستہ اور بوسیدہ حالت میں ہے، اور اس کے سامنے ایک سہ منزلہ بلڈنگ تعمیر ہو چکی ہے، گویا اس طرح وہ عصرِ حاضر کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو گئی ہے۔ اقبالؔ نے مسلمان لڑکی کو یہ مشورہ دیا تھا۔

؎ بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر

دخترِ ملت سے تو یہ کوٹھی ہی اچھی رہی، کہ اقبالؔ کا کہنا تو مان لیا۔

ہاں! تو علامہ ایک چارپائی پر گاؤ تکیہ کے سہارے نیم دراز تھے اور حقہ پی رہے تھے، میں نے "چلم" کے لیئے "ٹوپی" کا لفظ پہلی بار انہیں کی زبان سے سنا ـــ علیک سلیک کے بعد کچھ گفتگو ہوئی، اس کے بعد میں نے اپنی ملاقات کا مُدعا ظاہر کیا، یعنی علامہ اقبال سے دریافت کیا کہ حکماء کے دلائل تو کانٹ نے باطل ٹھیرا دیئے، اب ہم ذاتِ واجب کا اثبات کریں تو کیسے کریں؟ علامہ نے میرے اس سوال کا جو جواب دیا، سچ تو یہ ہے اُس نے میری زندگی میں ایک بہت بڑا ذہنی انقلاب برپا کر دیا۔ انہوں نے فرمایا "عقلی دلائل کی مدد سے واجب الوجود کا اثبات نہیں ہو سکتا، اس کے اثبات کا طریقہ باطنی مشاہدہ یا مذہبی تجربہ ہے، خداشناسی کا ذریعہ خرد نہیں، عشق ہے، جسے فلسفہ کی اصطلاح میں وجدان کہتے ہیں۔

خدا کی ہستی

پروفیسر چشتی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ میرے لیئے یہ بالکل نیا انکشاف تھا،

میں نے ۱۹۱۶ء میں فلسفہ کا مطالعہ شروع کیا تھا، اور افلاطون میرا پہلا استاد تھا، جس کی کتابوں REPUBLIC اور TIMAEUS کے نقوش میرے لوحِ ذہن و فکر پر نمایاں طور پر اُبھرے ہوئے تھے، اس کے بعد ارسطو کا مطالعہ کیا، جس کی "مابعد الطبیعات" مدتوں تک میرے دل و دماغ پر حکمراں رہی، اور اسی کتاب نے مسلکِ اعتزال کی راہ ہموار کی — یعنی عقل کو معیارِ حق و باطل، معیارِ خیر و شر، مذہبی معتقدات پر فائق، اور انکشافِ حقیقت کے لئے کافی سمجھنا۔ وغیرہ

علامہ نے چند ملاقاتوں کے بعد مجھے برگساں کے مطالعہ کا مشورہ دیا، تاکہ عقل کی نارسائی اور بے مائگی واضح ہو سکے، اس کی شہرۂ آفاق MATTER & MEMORY نے مادیت کا طلسم پاش پاش کر دیا، اور تخلیقی ارتقا اخلاق اور مذہب کے دو ماخذ نے انجام کار مجھے تصوّف کی آغوش میں پناہ لینے کے لئے آمادہ کر دیا۔

نقشے کہ بستہ ای ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

علامہ نے رفتہ رفتہ یہ حقیقت واضح کر دی کہ نہ تو خدا کی ہستی پر کوئی عقلی دلیل ایسی قائم ہو سکتی ہے جو قاطع ہو اور نہ عقل اُن اعتراضات کا خاطر خواہ جواب دے سکتی ہے، جو خود عقل ہی خالقِ کائنات کے وجود پر وارد کرتی ہے۔

زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل
بیا کہ عشق مسلمان و عقل زناری است

اس لئے خدا کی ہستی کا یقین اگر ہو سکتا ہے تو صرف مشاہدہ باطنی

RELIGIOUS EXPERIENCE کے ذریعہ سے۔

بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم — دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

خدا اور انسان کا رشتہ

پروفیسر صاحب جواب تک فلسفہ میں ڈوبے ہوئے تھے اور جن پر تمام تر عقلیات کا غلبہ تھا۔ علامہ اقبال نے ان کی توجہات کا رُخ مذہب کی طرف موڑ دیا، اور اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ قرآن کریم فلسفے اور الٰہیات کی کوئی تصنیف نہیں ہے اس کا مقصد دل کو اطمینان عطا کرنا ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ قرآن کریم کو اس زاویۂ نگاہ سے مت پڑھو کہ وہ تمہیں فلسفے کے مسائل سمجھائے گا، بلکہ اُسے اس زاویۂ نگاہ سے پڑھو کہ اللہ تعالیٰ سے میرا کیا رشتہ ہے، اور کائنات میں میرا کیا مقام ہے، قرآن اس لئے نازل ہوا ہے کہ وہ انسان میں خدا سے ربطِ قلبی کا اعلیٰ شعور پیدا کر دے تاکہ انسان اس ربط کی بدولت مشیتِ ایزدی سے ہم آہنگی پیدا کر سکے۔

زبورِ عجم

اقبالیات کے طالب علموں کے لئے ان مشاہدات اور تجربات میں بڑی بصیرت و عبرت کا سامان موجود ہے کہ وہی یوسف سلیم چشتی جو ۱۹۲۲ء میں مثنوی اسرارِ خودی کو کسی توجہ کا مستحق سمجھے بغیر ایک طرف رکھ دیتے ہیں، جب اقبال کے افکارِ عالیہ سے پہلی بار آگاہ و باخبر ہوتے ہیں، تو اقبال کی تصانیف سے اُن کے شوق و دلچسپی کا یہ

عالم ہوتا ہے کہ "بانگِ درا" کو لفظاً لفظاً ایک بار "اسرار و رموز" کو دو بار اور "پیامِ مشرق" کو بار بار پڑھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی وہ مایۂ ناز کتاب جس کے بارے میں وہ خود فرماتے ہیں ؎

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم — فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

جب ۱۹۲۷ء میں شائع ہوتی ہے، تو پروفیسر یوسف سلیم چشتی فلسفہ اور دینیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اُسے سبقاً سبقاً پڑھتے ہیں، اور ایک ایک شعر کی معنویت میں ڈوب ڈوب جاتے ہیں؛ اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے کا موضوع خدا ہے، اور دوسرے کا موضوع انسان؛ خدا اور انسان کے بارے میں جن نظریات کا اظہار کیا گیا ہے وہ اس قدر جامع و مانع اور محکم ہیں کہ وہاں عقل کو اپنی کم مائگی کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ آخری حصہ "گلشنِ رازِ جدید" تو سراسر فلسفہ تصوف ہے اور وہ بھی جدید رنگ میں؛ گویا "شراب پرانی بوتل نئی" یہ کتاب اقبال کی عظمت کا ایک ایسا نقش قائم کرتی ہے کہ پروفیسر چشتی بے اختیار پکار اٹھتے ہیں ۔

روح را ذوقِ طلب دہ ز کلامِ اقبال
"دیدۂ دل بکشا" زینت پیامِ اقبال

یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تصانیف پڑھ کر یہ حقیقت سامنے آتی ہے، اور یہی حقیقت اُن کا پیام بھی ہے —— کہ دل کی آنکھیں کھول، تاکہ تجھے وہ عالمِ نظر آسکے جو ظاہر بیں آنکھوں سے مستور ہے؛ بالِ جبریل میں فرماتے ہیں ؎

دلِ بیدار فاروقی، دلِ بیدار کراری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

دل بیدار نہ ہو، تو ان ظاہری آنکھوں کے کھلے رہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اقبال کی نگاہ میں "دلِ بیدار" زندگی کی سب سے قیمتی دولت ہے۔

مستقل سرمایہ

دو سال مرے کالج سیالکوٹ میں رہ کر ۱۹۲۹ء کے آخر میں پروفیسر چشتی لاہور واپس آئے، اور ۱۹۳۰ء میں انجمن حمایت اسلام کے قائم کردہ اشاعتِ اسلام کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے، تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کا خطبۂ صدارت جو انہوں نے الٰہ آباد کے سالانہ اجلاس میں ارشاد فرمایا تھا۔ اشاعتِ اسلام کالج کے نصاب میں داخل کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کے سامنے اس کا ذکر آیا تو فرمایا۔

"یہ بہت اچھا کیا، مگر PERMANENT VALUE
دوامی قدر و قیمت کی چیز تو اس کا ابتدائی حصہ ہے،
اسے بہت غور سے پڑھو، تاکہ طلباء کو سمجھا سکو۔"

پروفیسر صاحب نے موقع غنیمت جان کر درخواست کی کہ اس خطبہ کا ابتدائی حصہ مجھے پڑھا دیجئے تاکہ میں آپ کے مفہوم سے کماحقہٗ واقف ہو سکوں؛ علامہ اقبال نے اُن کی درخواست کو قبول فرمالیا اور ۱۹۳۱ء میں انہوں نے یہ حصہ اقبال سے سبقاً سبقاً پڑھا، پڑھنے کے دوران وہ علامہ کے ایک ایک لفظ کو ہمہ تن شوق و توجہ بن کر سنتے، اور

جو کچھ سنتے اور سمجھتے اُس کا مفہوم اپنے شاگردوں کو لکھا دیتے ؛

فلسفۂ خودی

علامہ کی خدمت میں حاضری اور رسائی کے بعد پروفیسر صاحب نے اُن سے گلشن راز جدید بھی پڑھی ، یہ مشکل کتاب پوری توجہ ، انہماک اور مسلسل درس و تدریس کے باوجود دو مہینہ میں جا کر ختم ہوئی ، ۶ مارچ ۱۹۳۱ء کو جب انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے یہ شعر پڑھے ۔

مرا دل سوخت بر تنہائی او   کنم سامان بزم آرائی او
مثال دانہ می کارم خودی را   برائے او نگہ دارم خودی را

تو ڈاکٹر صاحب پر یکایک خاص کیفیت طاری ہو گئی ، اور کئی منٹ تک اشکوں کا سیلِ رواں تھم نہ سکا ۔

جو شخص نہ تصوف کا ذوق رکھتا ہے ، نہ اُس کا دل سوز و گداز سے آشنا ہے اور نہ وجدان عشق اور جذب و سلوک سے وہ باخبر ہے ۔ اُس کے لئے یہ سمجھنا بہت دشوار ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو کس بات نے یکایک سرشار و بے خود کر دیا ، جب افاقہ ہوا — تو ڈاکٹر صاحب نے پروفیسر چشتی کو مخاطب کر کے فرمایا ——

"تمہاری جگہ کوئی صاحب دل بیٹھا ہوتا ، تو بے اختیار تڑپنے لگتا "

"گلشن راز جدید" ختم کرنے کے بعد یوسف سلیم صاحب نے "اسرارِ خودی" بھی علامہ ہی

سے پڑھی ، اور اپنی استعداد اور فہم کے مطابق علامہ کے ارشادات سے استفادہ کیا ، ایک دن انہوں نے علامہ سے براہ راست سوال کر ہی دیا ——

"آپ کے فلسفۂ خودی کا ماخذ کیا ہے ؛ اور چونکہ آپ نے فرمایا ہے کہ خودی کا فلسفہ صوفیائے کرام اور قرآن کریم سے ماخوذ ہے ، اس لئے میں نے خاص طور پر یہ بات آپ سے پوچھی ہے "

فرمایا — ہاں یہ آیت استحکام خودی پر دال ہے ۔

"یٰاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا عَلَیۡكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ لَا یَضُرُّكُمۡ مَّنۡ ضَلَّ اِذَا اهۡتَدَیۡتُمۡ اِلَى اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝" (سورۂ مائدہ ، آیت ۱۰۵)

مفہوم : "اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم پر فرض ہے خودی کی حفاظت اگر تم ہدایت پر ہو ... تو وہ شخص جو گمراہ ہے ، تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا ، تم سبھوں کو اللہ ہی کے پاس واپس جانا ہے اور وہ تمہیں تمہارے اعمال پر مطلع کر دے گا (تاکہ ان کے مطابق جزا و سزا مل سکے)"

خطباتِ مدراس

خطباتِ مدراس جن کا پہلا ایڈیشن لاہور سے، اور دوسرا آکسفورڈ سے بعنوان

RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM

۱۹۳۵ء میں شائع ہوا ہے، ایک ایسی کتاب ہے جو عمیق فلسفہ اور نازک و دشوار افکار سے لبریز ہے، اسے بہت کم لوگوں نے پڑھا اور سمجھا ہے۔ جس کا شکوہ خود علامہ کو بھی قوم سے رہا، پروفیسر یوسف سلیم چشتی غالباً واحد شخصیت ہیں جو ان خطبات کو اب تک پندرہ سولہ بار پڑھ چکے ہیں۔ اور بار بار نیا لطف اٹھاتے اور محسوس کرتے ہیں کہ ہر مطالعہ کے بعد حقائق و معارف کے کچھ نئے گوشے سامنے آ رہے ہیں، جب اس کتاب کا ذکر نکلا تو پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ بعض کتابیں طالبانِ علم کی تمام عمر کی رفیق بن جاتی ہیں، مثلاً ابنِ سینا نے ارسطو کی "مابعدالطبیعات" کو تیس بار پڑھا تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں چالیس بار پڑھا تھا۔ پروفیسر صاحب جو تیس سال کے بعد اب ان خطبات کی اردو شرح کی تڑپ دل میں رکھتے ہیں، فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک بار خاص انداز میں فرمایا۔

"اگر میری یہ کتاب (تشکیلِ جدید) خلیفہ مامون الرشید کے
دور میں شائع ہوتی تو پورے عالمِ اسلام میں ایک تہلکہ مچ جاتا"

عزیز ترین شعر

"مثنوی پس چہ باید کرد" کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے

ایک بار علامہ کی خدمت میں عرض کیا کہ ——— آپ کی ساری شاعری جسم ہے۔ اور مثنوی پس چہ باید کرد "اُس کا دل" ——— پروفیسر موصوف کا بیان ہے کہ میری اس رائے پر علامہ اس انداز سے مسکرائے، جیسے کسی نے اُن کے دل کی بات کہہ دی ہو۔ جب ۱۹۲۷ء میں "زبورِ عجم" شائع ہوئی، تو پروفیسر چشتی اس کا نسخہ بازار سے خرید کر اور اس کی خوشنما جلد بنوا کر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا ——— بانگِ درا، اسرار و رموز، اور پیامِ مشرق آغا طاہر نے مجھے ہدیۃً دی تھیں، یہ پہلی کتاب ہے، جسے میں نے خرید کر پڑھا ہے، میری دلی تمنا ہے کہ آپ اس کتاب پر اپنے قلم سے اپنا پسندیدہ شعر لکھ دیں، جو آپ کی پوری شخصیت اور تمام شاعری پر حاوی ہو" علامہ نے ایک بھرپور نگاہ مجھ پر سر سے لے کر پیر تک ڈالی۔ سنجیدہ چہرہ پر زیرِ لب تبسم کی کلیاں سی بکھر گئیں۔ یہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کا واقعہ ہے۔ نومبر ۱۹۲۷ء کی ۱۴ تاریخ تھی، علامہ نے کتاب پر، قلمدان منگوایا اور یہ شعر اپنے قلم سے لکھ کر، دستخط ثبت فرمائے۔

"تو شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام"

"حاسدِ استانی"

پھر عقل و عشق کا موازنہ کرتے ہوئے یہ حکیمانہ نکتہ واضح کیا۔ کہ اس دنیا میں سارا جھگڑا خرد اور قلب کے درمیان ہے، یہ صرف دل ہی ہے جو خرد سے اُلجھتا ہے اور کوئی اس سے اُلجھنے کی جرأت نہیں کرتا، فرمایا اس کائنات میں خرد بلا شرکتِ غیرے حکمران ہے، خرد و د

"حاسد اُستانی ہے جو کسی کی شرکت یا مداخلت گوارا نہیں کرتی۔ تم خرد کی طاقت کا اندازہ اس سے کر سکتے ہو کہ انسان خدا بھی وہی پُوجتا ہے جسے اُس کی عقل پسند کرتی ہے، حد یہ ہے کہ ظالم، خدا تک تراش لیتی ہے۔ تنہا دل ہے جو خم ٹھونک کر سامنے آتا ہے اور برملا کہتا ہے کہ تو غلط کہتی ہے۔" ان کی اس عالمانہ گفتگو نے مجھ پر آن کے اس شعر کا مفہوم پوری طرح واضح کر دیا ؎

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں

راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

حیاتِ جاوداں

حیاتِ جاوداں اور ابدیت کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے افکار جا بجا مختلف رنگوں میں اسلوب بدل بدل کر پیش کئے ہیں، اس موضوع پر اُن کا یہ شعر منفرد ہی نہیں اُن کے پورے پیغام کا ماحصل سمجھا جاتا ہے ؎

ہر لحظہ نیا طُور، نئی برقِ تجلی

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

وہ فرمایا کرتے تھے

IMMORTALITY IS NOT A GIFT,

MAN IS A CANDIDATE FOR IT

حیاتِ جاوداں وابدیت، تحفہ کے طور پر نہیں دی جاتی بلکہ اُسے حاصل کیا جاتا ہے، پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا بیان ہے کہ میں نے اس شعر کے مفہوم پر غور کیا تو دِل نے کہا کہ قرآنِ کریم میں اس کا ماخذ تلاش کرنا چاہئے، اس لئے کہ اقبال خود کہہ چکے ہیں ؏

گوہر دریائے قرآں سُفتہ ام

لہٰذا پوری اُمید کے ساتھ قرآن کا مطالعہ شروع کیا، اور یہ جستجو مسلسل جاری رہی۔ جوئندہ یابندہ آخر کار جس ماخذ کی تلاش تھی، وہ مل گیا ——————

لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ

جو لوگ ایمان لا کر اعمال صالح بجا لائیں گے ان کے لئے ایسا اجر ہوگا، جو کبھی ختم نہ ہو گا۔

قرآنِ کریم اور کلامِ اقبال

پروفیسر سلیم چشتی نے برسوں ان احوال کیفیات کا اپنی آنکھ سے مشاہدہ کیا ہے، پھر کلامِ اقبال سالہا سال سے اُن کے پیشِ نظر رہا، موصوف کی پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ رائے ہے کہ جس نے قرآنِ کریم کو پڑھا اور سمجھا نہیں ہے، وہ کلامِ اقبال کا مفہوم پانے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتا اور اس کا سبب یہ ہے کہ کلامِ اقبال کا ماخذ، منبع اور محور قرآنِ کریم ہے اس لئے پہلے قرآن کو پڑھئے اور پھر اقبال کے کلام سے لُطف اور فیض حاصل کیجئے۔

جواہر پارے

حکیم الامت علامہ اقبال کی زبان سے باتوں باتوں میں ایسے لاجواب فقرے نکل جاتے تھے کہ جن پر مقالے اور کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، ان میں سے چند ملفوظات یہاں پیش کئے جا رہے ہیں۔

FACE FACTS LIKE A MAN

(۱) زندگی کے تلخ حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرو، اُس شتر مرغ کی طرح نہیں۔ جو شکاری کو دیکھ کر ریت میں مُنہ چھپا لیتا ہے مسلمانوں کی عام ذہنیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ حقائق کا مقابلہ کرنے سے گریزاں ہیں۔

MUSLIMS OF INDIA HAVE CEASED TO THINK

(۲) ہندوستان کے مسلمانوں نے غور و فکر کرنا بالکل ترک کر دیا ہے وہ راکھ کا ڈھیر ہیں۔ اور صرف روایات پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت روایات میں کھو گئی

GOD IS, MAN IS BECOMING

(۳) وجود صرف خدا کا ہے انسان موجود ہونے کی کوشش کر رہا ہے، اگر خودی زندہ ہو جائے تو انسان بھی موجود ہو سکتا ہے۔ وجودِ مُقیّد کو وجودِ مطلق سے جتنا قُرب حاصل ہو گا وہ اُسی قدر موجود ہوتا جائے گا۔

PERSONALITY IS THE CRITERION OF VALUE

(۴) انسانی شخصیت اشیاء کے حُسن و قبح کی کسوٹی ہے جو فعل خودی کو مستحکم کرے وہ حسین ہے جو خودی کو ضعیف بنائے وہ قبیح ہے (خودی اور انا وہی ہے جسے انگریزی میں EGO OR SELF کہا گیا ہے)

"ISLAM APPEALS TO MAN AS A WHOLE"

(۵) اسلام انسانی شخصیت کے تینوں پہلوؤں کی یکساں تربیت اور آبیاری کرتا ہے

(۱) شعور (۲) جذبہ اور (۳) ارادہ

KNOWING, FEELING & WILLING

DEATH IS ALSO AN ASPECT OF LIFE

(۶) موت بھی حیاتِ انسانی ہی کا ایک پہلو ہے، زندگی اس سے آگے بھی ہے بحث یہ تھی کہ موت زندگی کے خاتمہ کا نام نہیں ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

زندگی دراصل انسان میں قوتِ اعجاز پیدا کر دینے کا دوسرا نام ہے ؎

زندگی جز قوتِ اعجاز نیست
ہر کسے داندۂ ایں راز نیست

مہمل نظم پر انعام

۱۹۱۸ء کا ذکر ہے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک مزاحیہ مشاعرہ ہوا، ڈاکٹر محمد اقبال صدر تھے، اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ سنجیدہ اور فکر آمیز شاعری کی بجائے بے تکلفانہ انداز میں ظرافت آمیز شاعری سے سامعین کی تواضع کی جائے۔ راقم الحروف کے دوست ریاض قریشی جو اب سیشن جج کے عہدے سے ریٹائر ہو چکے ہیں، اُس وقت ایف، اے کے طالب علم تھے، وہ ہری چند اختر کی ایک نظم پر پیروڈی کہہ کر لائے۔

انہوں نے اسٹیج پر اس انداز کے اشعار پڑھے۔

کہا تھوڑی سی مجھے پی لوں کہا تھوڑی سی مجھے پی لو　　کہا قرآن کا ڈر ہے کہا قرآن تو ہوگا
کہا میں جھوٹ بھی بولوں کہا تم جھوٹ بھی بولو،　　کہا ایمان کا ڈر ہے کہا ایمان تو ہوگا

ان اشعار نے مشاعرہ گاہ کو دیوارِ قہقہہ بنا دیا۔ لوگ ہنسی کے مارے لوٹے جا رہے تھے، ڈاکٹر صاحب بھی کرسئ صدارت پر مسکرا رہے تھے، جب تقسیم انعام کا وقت آیا تو ڈاکٹر صاحب نے ریاض قریشی کو "BAD POETRY" کا پہلا انعام مرحمت فرمایا۔ ریاض قریشی آج بھی اپنی اس جسارت کو یاد کرکے حیران رہ جاتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کی "حقیقت شناسی" اور "معاملہ فہمی" کا اعتراف کرتے ہیں:

حادثۂ قتل

لاہور کے مشہور معالج ڈاکٹر محمد حسین، ڈاکٹر محمد اقبال کے ہم جماعت اور گہرے دوست تھے۔ ان کے بھائی سید نادر حسین تحصیلدار ۲۸ جولائی ۱۹۱۸ء کو فوجی بھرتی کے کام میں مصروف تھے کہ برطانوی حکومت کے خلاف ایک سازش میں قتل کر دیئے گئے۔ ڈاکٹر محمد حسین کے لئے یہ صدمہ جانکاہ تھا، اشک خونیں صفحۂ قرطاس پر تاریخ وفات کی صورت میں ڈھل گئے، یہ قطعہ تاریخ ڈاکٹر محمد حسین بغرض اصلاح ڈاکٹر اقبال کے پاس لائے، انہوں نے اُسے رکھ لیا۔ اور چند روز بعد اپنے اور اپنے دوست کے غم آگیں احساسات کو ان یادگار اشعار میں ڈھال دیا۔ جن کا عکس اس کتاب میں شائع کیا جا رہا ہے۔

سید نادر حسین کے صاحب زادے سید شبیر حسین اور ڈاکٹر محمد حسین کے لڑکے کرنل

ڈاکٹر بشیر حسین ریٹائرڈ ڈائرکٹر سلیتھ مغربی پاکستان مصنف کے دوست ہیں اور اس خاندان میں ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر محمد حسین کی پُرخلوص دوستی پر جس قدر فخر کیا جاتا ہے راقم الحروف اس کیفیت سے واقف ہے، سید نادر حسین کے بڑے صاحب زادے سید عنایت حسین شاہ تو گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم کے دوران ڈاکٹر محمد اقبال کے شاگرد بھی رہ چکے ہیں۔ اور اسے زندگی بھر باعثِ سعادت سمجھتے رہے ہیں، ان کا مشاہدہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب دوسرے پروفیسروں کی طرح گھر سے تیاری کرکے کالج نہیں آیا کرتے تھے، اس کے باوجود یوں محسوس ہوتا تھا، کہ علم و تدریس کا ایک سیلِ رواں ہے جو روکے نہیں رُک سکتا، بڑے سخت ممتحن تھے، نمبر غیر معمولی احتیاط سے دیتے تھے، اگر کوئی شخص کسی کمزور طالب علم کے نمبر بڑھانے کی سفارش کر بیٹھتا، تو انہیں غصہ آجاتا۔ اور ڈانٹ دیتے، برملا کہہ دیا کرتے کہ نااہل اور نالائق نوجوان میری قوم میں سے نہیں ہیں۔

ایک بار کسی نے ذکر چھیڑ دیا کہ مسجد کے اندر بلی نے بچے دے دیئے ایک صحابی نے کسی قدر ناراضگی سے اُنہیں باہر پھینکنے کی کوشش کی۔ آنحضرت کی نظر پڑ گئی۔ تو سخت کبیدہ خاطر ہوئے یہ واقعہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب پر رقت طاری ہوگئی۔ فرمایا۔ کہ رسولِ کریمؐ کے اسوۂ حسنہ میں سب سے زیادہ اہمیت MOTHER HOOD (مادرانہ شفقت) کو دی گئی ہے کہ یہی بنی نوع انسان کی بقا کا مقدس ذریعہ ہے۔

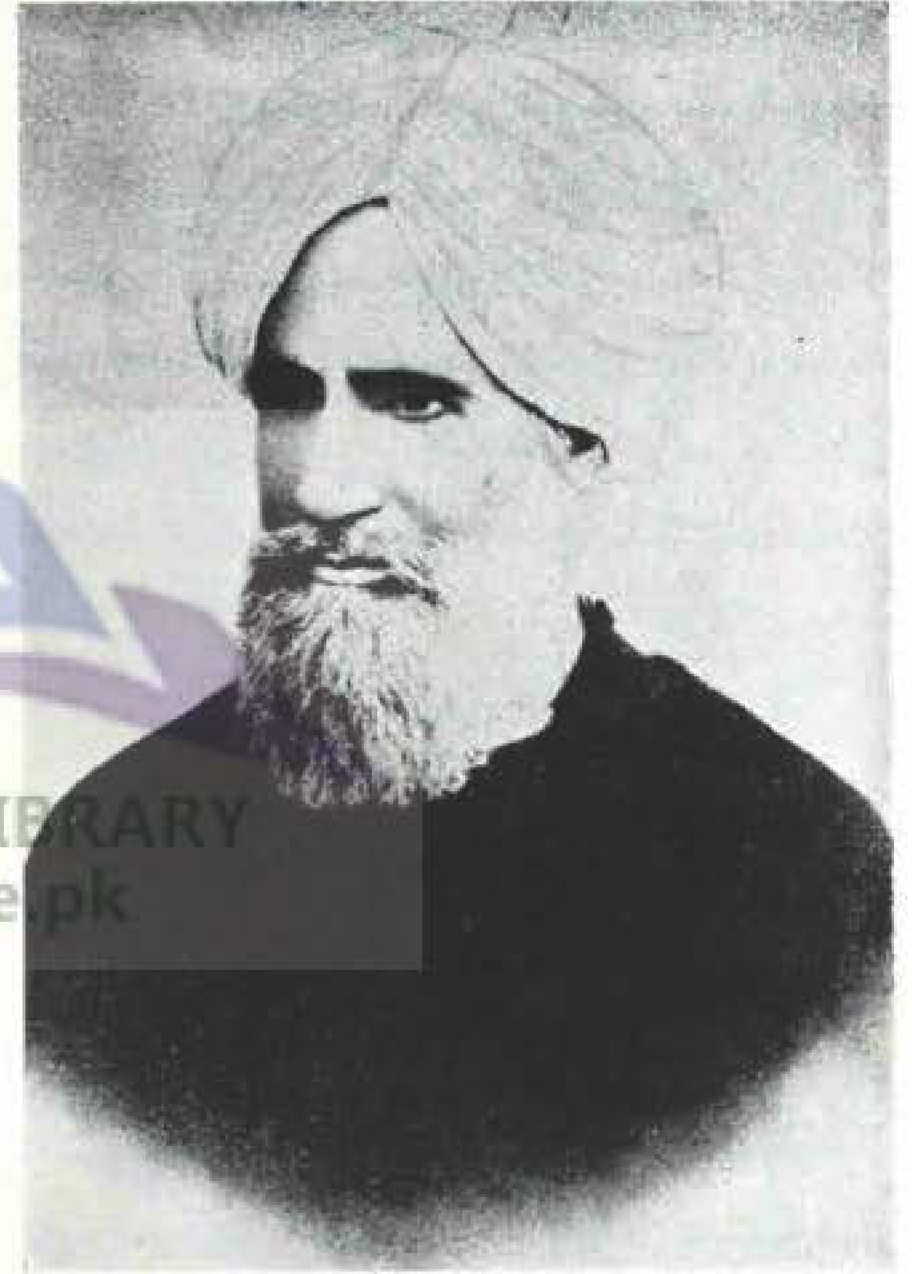
ڈاکٹر محمد حسین کا خاندان سیالکوٹ وطن مالوف ہونے کی وجہ سے ایسے متعدد واقعات کا شاہد ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب زمانہ طالب علمی میں بھی بڑے ہونہار تھے، دوسرے والدین اپنے بچوں کو ان کی مثال دیا کرتے، اور کم سنی کے

باوجود شعر و شاعری کی محفلوں میں ان کے پُرلطف اشعار کو بڑی دلچسپی سے سُنا جاتا۔ اُن دنوں سیالکوٹ کے دو خوش طبع میاں جھنڈے خاں اور ماسٹر جگن ناتھ میں خوب نوک جھونک رہتی تھی، میاں جھنڈے خاں نے خوب قدآور ہونے کی وجہ سے یہ لقب پایا تھا اور ماسٹر جگن ناتھ تھے پستہ قامت اور بلا کے عاشق مزاج۔ چنانچہ ایک محفل میں ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں کے متعلق ایک شعر پڑھا۔ جس کا مفہوم یہ تھا۔ کہ "ماسٹر جگن ناتھ کا محبوب ماسٹر صاحب سے کہہ رہا ہے کہ تم جو مجھ سے بار بار مطالبہ کرتے ہو کہ "میرا دل دو میرا دل واپس دو" تو میں نے تمہارا دل میاں جھنڈے خاں کے سر پر رکھ دیا ہے اگر تم وہاں سے اُٹھا سکتے ہو تو اُٹھا لو" ـــــ یہ شعر کافی عرصے تک سیالکوٹ کی مجلسی زندگی کو گرماتا رہا۔

خاندانی حالات

ڈاکٹر محمد اقبال کے علم و فلسفہ کا ارتقا کس ماحول میں ہوا، اور ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور عاشق رسولؐ کی حیثیت سے اُن کا کردار کس بنیاد پر تعمیر ہوا، اسے پوری طرح سمجھنے کے لیے اُن کے خاندانی حالات، گھریلو تربیت اور گرد و پیش کے ان تمام محرکات کا ذہن نشین کرنا ضروری ہے جس نے ڈاکٹر صاحب کی زندگی اور تعمیر میں نمایاں پارٹ ادا کیا ہے، وہ جو کسی مفکر نے کہا ہے کہ بچہ کی پہلی یونیورسٹی، اس کا اپنا گھر ہوتا ہے، تو ڈاکٹر صاحب کو بھی دورِ طفولیت میں اپنے گھر ہی سے واسطہ پڑا، اور اسی ماحول نے سب سے پہلے اُن کی زندگی کی لوحِ سادہ پر اپنے نقوش ثبت کئے۔

ڈاکٹر صاحب جس گھرانے میں پیدا ہوئے، وہ سیالکوٹ کے بازار چوڑی گراں رجو



حکیم الامت کے والد شیخ نور محمد مرحوم

اب اقبال بازار کے نام سے مشہور ہے، کے کشمیرزادہ خانوادوں میں ایک متوسط لیکن باعزت گھرانا سمجھا جاتا تھا ان کے والد شیخ نور محمد زیادہ لکھے پڑھے نہ تھے، لیکن وہ مذہبی علوم سے بڑا شغف رکھتے تھے، اور علماء اور صوفیا کی صحبتوں سے ہمیشہ استفادہ کرتے رہتے اس شوق اور شغف کی بدولت ڈاکٹر صاحب کے والد میں علمی ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ جہاں کہیں ذکر رسول کے لئے محفل آراستہ ہوتی، تو شیخ نور محمد اس میں بڑے شوق اور عقیدت کے ساتھ شریک ہوتے، ڈاکٹر صاحب کی تربیت ایک ایسے باپ کے سایۂ عاطفت میں ہوئی، جو دینی مزاج رکھتے تھے اور عشق رسول تو انہیں اپنے والد محترم سے وراثت میں ملا۔

شیخ نور محمد خوش قسمت تھے کہ ان کی زندگی ہی میں اُن کے نامور فرزند محمد اقبال کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی، انہوں نے طویل عمر پائی۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال سے آٹھ سال قبل ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء کو سیالکوٹ میں اُن کا انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

ڈاکٹر محمد اقبال کا جب بھی کوئی نیا مجموعہ کلام شائع ہوتا، تو سعادت مند بیٹے کی زبانی سے "پیغام حق" سن کر بارگاہ خداوندی میں وہ سجدۂ شکر بجا لاتے، اور جذب و معرفت کے مضامین خاص طور سے مثنوی "اسرار خودی" پڑھ کر بے چین ہو جاتے، یہاں تک کہ زار و قطار رونے لگتے۔ یہ آنسو شکر کے آنسو بھی تھے اور محبت کے بھی: آخری عمر میں اُن کی کیفیت اور زیادہ شدید ہو گئی تھی۔

ایک اور پہلو قابل ذکر ہے کہ:۔

شیخ نور محمد کی پیدائش سے قبل چونکہ اُن کے والدین کے یہاں دس لڑکے یکے بعد دیگرے پیدا ہو کر فوت ہو گئے، اس لئے شیخ نور محمد کے پیدا ہونے سے پہلے اور بعد

میں اُن کے والدین نے وہ تمام رسوم ادا کیں، جن کو صرف جہالت اور ضعیف الاعتقادی اور بے اولاد والدین کی ایک خاص اضطرابی کیفیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے شیخ نور محمد کی پیدائش پر ان کی ناک چھید دی گئی؛ اور اُس میں ایک چھوٹی سی نتھ پہنا دی گئی؛ گویا اپنے زعم میں قدرت کے سامنے لڑکے کو لڑکی بنا کر پیش کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے، کہ لڑکپن میں کئی سال تک شیخ نور محمد اس نتھ کو پہنے پھرتے رہے؛ اسی رعایت سے اُن کا عرف "نتھو" پڑ گیا۔ــــــــ

شیخ نور محمد کے پاس رہنے کے لئے قدیم وضع کا ذاتی مکان تھا زرعی املاک سرے سے وہ رکھتے ہی نہ تھے، ڈاکٹر اقبال کی قلندریت اور درویش صفتی پر باپ کی شانِ فقر بھی اثر انداز ہوئی؛ اقبال جسے "خودی" کہتے ہیں وہ در اصل قصر و ایوان میں نہیں غریب گھر کے ماحول ہی میں نشو و نما پاتی ہے۔

ڈاکٹر اقبال کو خوش قسمتی سے صالح، قناعت پسند اور درویش مزاج باپ کا سایہ شفقت اور بے انتہا شفیق اور پاک سیرت ماں کی آغوش میسر آئی۔ دینداری اور رسول کی محبت تو اقبال کی گھٹی میں پڑی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کی والدہ کا نام امام بی بی تھا، وہ بڑی نیک سیرت اور عبادت گذار خاتون تھیں؛ ان کی شفقت اور صحیح تربیت کا ڈاکٹر صاحب کی زندگی پر بڑا گہرا اثر تھا۔ وہ اپنی والدہ کا جس قدر احترام کرتے تھے اس سے اُن کا کوئی عزیز اور دوست بے خبر نہ تھا چنانچہ ۸۰ سال کی عمر میں جب ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو ڈاکٹر صاحب کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا۔ تو اکبر الٰہ آبادی نے دوست کے غم میں شریک ہونے کے لئے ایک برجستہ



علامہ اقبال کی والدہ مرحومہ

تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات (اقبال)

قطعہ تاریخ وفات کہا۔ جو آج بھی مرحومہ کے لوحِ مزار پر کندہ ہے ـــــــــ

قطعہ یہ ہے ؎

مادرِ مخدومہ اقبال رفت

سوئے جنت زی جہانِ بے ثبات

گفت اکبر با دل پُر درد و غم

رحلت مخدومہ تاریخ وفات

۱۳۳۲ھ

ڈاکٹر صاحب کے والد شیخ نور محمد کے انتقال پر ان کی لوحِ مزار پر جو قطعہ تاریخ کندہ کرایا گیا، اور اب تک عبرت گہِ عوام ہے، وہ مندرجہ ذیل ہے:- ؎

پدر و مرشد اقبال ازیں عالم رفت

ما ہمہ راہرواں منزل ما ملکِ ابد

ہاتف از حضرت حق خواست چو تاریخ رحیل

آمد آواز اثر رحمت و آغوش لحد

۱۳۳۹ھ ۱۳۳۹ھ

شیخ عطا محمد

۱۸۵۹ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تعلیم گھر پر ہی حاصل کی سکولوں و کالجوں کا سلسلہ آغاز ابھی ناپید تھا، فوج میں ملازم ہو کر عملی زندگی میں قدم رکھا۔ پھر رڑکی کالج سے انجینئرنگ کا ڈپلوما حاصل کیا ملٹری ورکس سروس سے باقاعدہ وابستہ ہونے کے بعد کوئٹہ ایبٹ آباد کیمبل پور، پاراچنار، اور پشاور میں تعینات رہے: ۱۹۰۵ء میں ڈاکٹر محمد اقبال



ڈاکٹر محمد اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد مرحوم
(۱۸۵۹ ـــــــ ۱۹۴۰)

کی انگلستان روانگی کے وقت وہ ایبٹ آباد میں تھے، مطالعہ کے علاوہ انہیں صرف فن تعمیر سے گہری دلچسپی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں جب ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوا۔ تو یہ غم ان کے لئے ایسا ہی ناقابل برداشت تھا۔ جیسے بوڑھے باپ کے لئے جوان بیٹے کی موت۔! بھائی کی موت کے بعد اکثر خاموش اور پژمردہ رہتے، بالآخر عظیم المرتبت چھوٹے بھائی کے انتقال کے دو سال بعد ہی ۲۲ دسمبر ۱۹۴۰ء کو فرشتۂ اجل نے انہیں بھی آ لیا۔ انتقال کے وقت اُن کی عمر ۸۱ سال تھی۔ اور پسماندگان میں تین لڑکے (۱) شیخ اعجاز احمد (۲) شیخ امتیاز احمد (۳) اور شیخ مختار احمد تھے۔

شیخ اعجاز احمد

شیخ اعجاز احمد کی تعلیم و تربیت، ملازمت اور مستقبل کی زندگی سے ڈاکٹر صاحب کو ہمیشہ گہری دلچسپی رہی اور شیخ صاحب کو ڈاکٹر صاحب کو بحیثیت چچا، بحیثیت مفکر، بحیثیت شاعر اور فلسفی بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ ۱۲ جنوری ۱۸۹۹ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے، سکاٹ مشن ہائی سکول سیالکوٹ سے میٹرک اور اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا۔ یہیں ایل ایل بی کا امتحان دیا۔ اور کامیاب ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے مشورہ سے وکالت شروع کر دی، کچھ عرصے بعد محکمہ انکم ٹیکس میں چلے گئے۔! پھر ہائیکورٹ کو اپنی خدمات منتقل کر دیں، موگہ، دہلی، حافظ آباد اور چونیاں میں سب جج رہے۔ قیام پاکستان کے وقت وہ حکومت ہند کے محکمہ خوراک میں تھے،

۱۹۴۷ء میں پاکستان کے دارالحکومت کراچی چلے آئے۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں



ڈاکٹر محمد اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد

سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد چار سال پی آئی ڈی سی سے وابستہ رہے اور آج کل کراچی میں F. A. O. COUNTRY REPRESENTATIVE ہیں۔

شیخ اعجاز احمد ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں اس حقیقت کا شدت سے احساس ہے، کہ ڈاکٹر صاحب نے جس نصب العین، انسانی شعور کی ارتقا، اور قومی سربلندی کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی وہ ہنوز کتابی سرمایہ ہے ہماری علمی زندگیاں دانائے راز کے زندگی آموز فرمودات کا نمونہ بننے سے سراسر قاصر رہی ہیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال

ڈاکٹر صاحب نے گجرات، لاہور اور لدھیانہ کے گھرانوں میں تین شادیاں کیں، پہلی بیوی بیرسٹر آفتاب اقبال کی والدہ تھیں جن کا انتقال مارچ ۱۹۴۶ء میں ہوا اور دوسری بیوی نے ۱۹۲۴ء میں وفات پائی، تیسری بیوی لاہور کی تھیں، ان کے بطن سے جاوید اور منیرہ پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء میں ہوا تو جاوید سلمہ کی عمر گیارہ سال اور منیرہ کی عمر پانچ برس کی تھی۔ جاوید اور منیرہ کی عمر میں چھ سال کی چھوٹائی بڑائی ہے۔ جاوید ۱۹۲۴ء میں اور منیرہ ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے جس احتیاط اور اخلاقی اصول کی تبلیغ فرماتے رہے، اس پر سختی کے ساتھ کاربند بھی رہے چنانچہ منیرہ کی تعلیم و تربیت کے لئے شروع میں ایک لائق اور با اخلاق مسلمان خاتون تلاش کی گئی علی گڑھ اور دوسرے مقامات پر خطوط لکھے گئے، اخبارات میں اشتہار بھی دیا گیا، مگر کوئی مسلمان

اُستانی اس تلاش و جستجو کے باوجود نہ مل سکی، اس لئے بدرجۂ مجبوری ایک جرمن لیڈی کی خدمات حاصل کی گئیں جرمن خاتون علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی ہمشیرہ تھیں ۱۹۳۶ء میں منیرہ کی تعلیم کا آغاز ہوا ڈاکٹر صاحب کو اپنی یہ بچی بہت عزیز تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد بھی منیرہ کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ اور زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونے کے بعد بڑے ہو کر منیرہ کی شادی ہو گئی۔

جاوید میاں سے جو خدا کے فضل سے خود بھی انگلستان سے بیرسٹری اور پی، ایچ، ڈی کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو بے پناہ محبت تھی، اپنی زندہ جاوید کتاب "جاوید نامہ" کا نام، جاوید اقبال ہی کے نام پر رکھا جاوید سے وہ کس محبت آمیز انداز میں خطاب فرماتے ہیں ؎

حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

اس ایک شعر میں پوری نوجوان نسل کے لئے عالمگیر پیغام ہے، پہلا مصرعہ عصر حاضر کے ماحول پر بھرپور طنز ہے، ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے مضمون "اقبال باپ کی حیثیت سے" میں بڑے حسین اور نفسیاتی انداز میں اپنے شفیق و عظیم باپ کے ان جذبات کا اعتراف کیا ہے

دلچسپ خطاب

ڈاکٹر صاحب کے والد شیخ نور محمد کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ علماء صالحین اور بزرگانِ دین کی صحبت میں بیٹھنا باعثِ سعادت سمجھتے اور جب

سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد چار سال پی آئی اڈی سی سے وابستہ رہے اور آج کل کراچی میں F. A. O. COUNTRY REPRESENTATIVE ہیں۔

شیخ اعجاز احمد ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں اس حقیقت کا شدت سے احساس ہے، کہ ڈاکٹر صاحب نے جس نصب العین، انسانی شعور کی ارتقا، اور قومی سربلندی کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کردی تھی وہ ہنوز کتابی سرمایہ ہے ہماری علمی زندگیاں ان کے راز کے زندگی آموز فرمودات کا نمونہ بننے سے سراسر قاصر رہی ہیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال

ڈاکٹر صاحب نے گجرات لاہور اور لدھیانہ کے گھرانوں میں تین شادیاں کیں، پہلی بیوی بیرسٹر آفتاب اقبال کی والدہ تھیں جن کا انتقال مارچ ۱۹۴۶ء میں ہوا اور دوسری بیوی نے ۱۹۲۴ء میں وفات پائی، تیسری بیوی لاہور کی تھیں، ان کے بطن سے جاوید اور منیرہ پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء میں ہوا تو جاوید سلمہ کی عمر گیارہ سال اور منیرہ کی عمر پانچ برس کی تھی۔ جاوید اور منیرہ کی عمر میں چھ سال کی چھوٹائی بڑائی ہے۔ جاوید ۱۹۲۴ء میں اور منیرہ ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے جس احتیاط اور اخلاقی اصول کی تبلیغ فرماتے رہے، اس پر سختی کے ساتھ کاربند بھی رہے چنانچہ منیرہ کی تعلیم و تربیت کے لئے شروع شروع میں ایک لائق اور با اخلاق مسلمان خاتون تلاش کی گئی علی گڑھ اور دوسرے مقامات پر خطوط لکھے گئے، اخبارات میں اشتہار بھی دیا گیا، مگر کوئی مسلمان

اُستانی اس تلاش و جستجو کے باوجود نہ مل سکی، اس لئے بدرجۂ مجبوری ایک جرمن لیڈی کی خدمات حاصل کی گئیں جرمن خاتون علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی ہمشیرہ تھیں ۱۹۳۶ء میں منیرہ کی تعلیم کا آغاز ہوا ڈاکٹر صاحب کو اپنی یہ بچی بہت عزیز تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد بھی منیرہ کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اور زیور تعلیم سے آراستہ ہونے کے بعد بڑے ہو کر منیرہ کی شادی ہو گئی۔

جاوید میاں سے جو خدا کے فضل سے خود بھی انگلستان سے بیرسٹری اور پی، ایچ، ڈی کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو بے پناہ محبت تھی، اپنی زندہ جاوید کتاب جاوید نامہ کا نام، جاوید اقبال ہی کے نام پر رکھا جاوید سے وہ کس محبت آمیز انداز میں خطاب فرماتے ہیں ؎

حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

اس ایک شعر میں پوری نوجوان نسل کے لئے عالمگیر پیغام ہے، پہلا مصرعہ عصر حاضر کے ماحول پر بھرپور طنز ہے، ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے مضمون "اقبال باپ کی حیثیت سے" میں بڑے حسین اور نفسیاتی انداز میں اپنے شفیق و عظیم باپ کے ان جذبات کا اعتراف کیا ہے

دلچسپ خطاب

ڈاکٹر صاحب کے والد شیخ نور محمد کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ علماء صالحین اور بزرگان دین کی صحبت میں بیٹھنا باعث سعادت سمجھتے اور جب

اطلاع ملتی کہ کسی جگہ کوئی بزرگ، صوفی یا عالمِ دین تشریف لائے ہیں، تو وہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کر، اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کی کوشش کرتے، اور وہاں پہنچ کر ان کے وعظ و تلقین اور ارشادات و ملفوظات سے متاثر ہوتے۔ اس استفادے نے اُن میں علم و عرفان کا ذوق پیدا کر دیا تھا۔ شیخ نور محمد کے ان حالات و کیفیات کو دیکھ کر اور اُن سے متاثر ہو کر ڈاکٹر صاحب کے اُستاد شمس العلماء مولوی سیّد میر حسن نے انہیں "اَن پڑھ فلسفی" کا خطاب دیا۔ دوسرے بہت سے لوگ بھی شیخ نور محمد کو اسی لقب "اَن پڑھ فلسفی" سے یاد کرتے۔

شمس العلماء مولوی سیّد میر حسن

مولوی سید میر حسن کا شمار اُن اساتذہ میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے شاگردوں کو صرف نصاب کی کتابیں نہیں پڑھائیں اور رسمی تعلیم دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اُن کی تعلیم و تربیت اس انداز پر کی کہ وہ کارزارِ حیات میں کامیاب غالب اور فتح مند ہو سکیں اور جن کا ناخنِ فکر و تدبیر زندگی کے عُقدوں کی گرہ کشائی کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب ساری زندگی اپنے استاد کی شفقت و محبت، قابلیت اور نیک نفسی کی تعریف کرتے رہے۔ کسی شاگرد نے اپنے استاد کی خوبیوں کا اس عقیدت کے ساتھ اعتراف بہت کم کیا ہوگا۔

مولوی سیّد میر حسن سیالکوٹ کے ایک دیندار خانوادۂ سادات میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد سید محمد شاہ شہر کے معروف طبیب تھے۔ ان کی مکتبی زندگی کا آغاز اس طرح ہوا کہ بالکل کمسنی میں قاعدہ ختم کرا کے حرف شناسی کے بعد اُن کے والد نے قرآن کریم

کا ایک رکوع سبق کے طور پر پڑھایا۔ تھوڑی دیر بعد دریافت کیا۔ کیا تم نے سبق یاد کر لیا! ہونہار بیٹے نے کہا زبانی یاد کر لیا! حکیم محمد شاہ صاحب نے حیرت سے پُوچھا۔ کیا تم نے رکوع زبانی یاد کر لیا ہے! اور اس کے بعد سیّد میر حسن نے پُورا رکوع زبانی فر فر سُنا دیا۔ حکیم صاحب بیٹے کی ذہانت سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے تہیّہ کر لیا کہ اپنے ذہین بیٹے کو حافظِ قرآن بناؤں گا۔ علم دوست اور عالم باپ، ذہین اور سمجھدار بیٹا، درس و تدریس کی تمام سہولتیں مہیا، تیرہ چودہ سال کی عمر ہی میں سیّد میر حسن حافظ اور مولوی بن گئے۔ اس عمر میں فارغ التحصیل ہونے کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔

مولوی سیّد میر حسن جب تعلیم سے فراغت پا چکے تو اُن کے والد نے چاہا کہ وہ اپنے آبائی پیشہ "طبِ یُونانی" پر توجّہ دیں اور اس فن میں ناموری حاصل کریں۔ آمدنی کے لحاظ سے بھی یہ پیشہ بہت منفعت بخش تھا مگر مولوی صاحب کو اس پیشے سے طبعی لگاؤ نہ تھا۔ وہ نبّاض تو تھے لیکن فطرت کے نبّاض تھے، انسانی اجسام کے نبّاض نہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد روزگار کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا چنانچہ ایک مسجد میں امام مقرر ہوئے اور دن گزرنے کے بعد جب شام ہوئی تو ایک شخص کھانا لے کر آیا۔ مولوی میر حسن نے کھانا لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ احساسِ خودداری اور غیرتِ سادات نے اُن پر ایسی کیفیت طاری کر دی کہ بیہوش ہو کر مسجد کے صحن میں گر پڑے۔ بس یہ واقعہ مسجد کی امامت کا ڈراپ سین تھا!

پھر وہ چند دن کے بعد سیالکوٹ کے مشن سکول میں ملازمت کرنے کے لئے پہنچے، صبح کا وقت تھا۔ مشن اسکول کے پادری کے سامنے ایک کمسن اور نوخیز امیدوار ٹیچر کھڑا تھا۔ اُس نے ایک مسلمان معلّم سے اُن کا فارسی زبان و ادب میں امتحان لینے کے لئے کہا کہ وہ کس حد

تک طلبا کے لئے مفید اور کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ اُس معلّم نے مولوی صاحب کی فارسی قابلیت جانچنے کے بعد بڑی اچھی رائے دی۔ اور پادری نے اُسی وقت اُن کو پندرہ روپے ماہوار کی ملازمت کا پروانہ دے دیا۔ مولوی صاحب جب وہاں سے چلنے لگے تو پادری نے دریافت کیا۔

"میاں صاحب زادے تم نے اس سے پہلے بھی کہیں پڑھایا ہے"

مولوی صاحب چاہتے تو نوکری کی خاطر "ہاں" بھی کہہ سکتے تھے، مگر انہوں نے سچّی بات کہی، اُن کا جواب نفی میں تھا، اس پر پادری نے جلدی سے کہا۔

بابا! پھر تمہیں ہم صرف دس روپیہ ماہوار دیں گے'

وہ پندرہ روپے ماہوار کا حکم منسوخ؛

مولوی میر حسن کی عملی زندگی کا آغاز اس دس روپیہ ماہوار کی ملازمت سے ہُوا۔

مشن اسکول میں تیرہ چودہ سال کی عمر کا اُستاد دیکھنے والوں کے لئے ایک عجوبہ تھا۔ مگر مولوی صاحب نے اپنی سنجیدگی و وقار اور قابلیت کے جھنڈے گاڑ دیئے طلبا ہی نہیں بڑی بڑی عمر کے اساتذہ بھی اُن کا احترام کرتے تھے مولوی صاحب کی تمام زندگی نہایت شریفانہ زندگی تھی، وہ انسانیت دوست تھے اس لئے چاہے کوئی مسلمان ہو، ہندو، سکھ، یا عیسائی ہو سب کے ساتھ ہمدردی کرتے۔ پرہیزگاری، نیکی اور انسانوں کے ساتھ ہمدردی اور غمخواری کی زندگی، ایسے اچھے لوگ روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

مولوی میر حسن کی چھوٹی ہمشیرہ کا انتقال ہُوا، تو انہوں نے عہد کیا کہ ایصالِ ثواب کے لئے ہر روز اُن کی قبر پر جاؤں گا۔ اس عہد کو انہوں نے بڑی صداقت کے

ساتھ نبایا، شب بیداری اور تہجد گزاری کے بعد اوّل وقت فجر کی نماز ادا کرتے اور دن نکلنے تک قرآن کریم کی تلاوت کرتے پھر وہ قبرستان روانہ ہو جاتے۔ راستے میں قرآن کریم کے طلبا پہلے سے موجود ہوتے اُن کو چلتے چلتے سبق پڑھاتے اور پھر اپنی ہمشیرہ کی قبر پر حاضری دیتے۔ اور قبر تک پہنچتے تک قرآن کریم کی ایک منزل پوری کر لیتے وہاں سے گھر لوٹنے کے بعد سودا سلف بازار سے مول لیتے پاس پڑوس کی بیوہ عورتوں سے بھی پوچھ لیتے کہ بازار سے انہیں کچھ منگوانا تو نہیں ہے۔ نو بجے اسکول پہنچ جاتے، وقت کی خاص طور سے پابندی کرتے اور اسکول کے منتظمین کو شکایت کا موقع نہ دیتے وقت کے پابند، معاملہ کے صاف فرض شناس اور طالب علموں کے غمخوار اور ہمدرد؛ ــــــ یہ تھے مولوی میر حسن علامہ اقبال کے اُستاد؛

مولوی صاحب اسکول سے پڑھا کر گھر آتے تو ملاقاتیوں اور طالب علموں کی آمد شروع ہو جاتی، جب وہ وضو کرتے ہوتے تو اس وقت بھی پاس کھڑے ہوئے طلبا کو قرآن کریم کا درس دیتے سنتے جاتے بھی اور غلطی پر ٹوکتے بھی۔ ہمشیرہ کی قبر پر صبح سویرے جانے کا یہ معمول دو چار سال نہیں ۴۴ سال تک جاری رہا؛ جب اُن کے والدین حیات تھے، تو انہی دنوں مولوی صاحب کا تبادلہ وزیر آباد ہو گیا، وزیر آباد سے ہر اتوار کو پیدل چل کر والدین سے ملنے کے لئے سیالکوٹ آتے۔ سر سیّد احمد خاں کے وہ بڑے مدّاح تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ سر سیّد مسلمانوں میں علوم مغربی حاصل کرنے کی تحریک نہ چلاتے۔ تو ہندوستان کے مسلمان ترقی کی دَوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتے۔ مولوی میر حسن صاحب کی بعض تصانیف بھی ہیں، لیکن بقول ڈاکٹر صاحب اُن کی سب سے بڑی تصنیف "اقبال" تھے۔

ستمبر ۱۹۲۹ء میں مولوی صاحب کا انتقال ہوا تو شہر سیالکوٹ ماتم کدہ بن گیا چھوٹے بڑے ہر مذہب و ملت کے لوگ غم زدہ اور ملول تھے جیسے اُن کے خاندان کا کوئی بزرگ دنیا سے اُٹھ گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنے شفیق اُستاد کے انتقال کی خبر ملی، تو وہ میکلوڈ روڈ والے مکان سے اُسی وقت خبر سنتے ہی ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑے، وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ سیالکوٹ اس وقت کوئی گاڑی نہیں جاتی۔ اتفاق کی بات کہ اُس وقت ایک مال گاڑی وزیرآباد جا رہی تھی، ڈاکٹر صاحب اس میں بیٹھ گئے، اور وزیرآباد پہنچ کر وہاں سے سیالکوٹ جانے کا کوئی بندوبست کیا۔ جب وہ اپنے استاد کے مکان پر پہنچے ہیں تو گھر میں ماتم برپا تھا ہر کوئی مغموم اور سوگوار تھا آنے جانے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

دُور دراز کے عزیزوں کا انتظار شدت سے ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب استاد کے آخری دیدار کے لئے سیالکوٹ پہنچے تو اُن کے خاندان کی خواتین دوسروں سے کہتی سُنی گئیں۔

"ساڈا اقبال تے آ گیا"

تجہیز و تکفین کے وقت ایک نازک مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ ہندو، سکھ اور عیسائی فرقوں کے سرکردہ نمائندے مولوی سیّد میر حسن مرحوم کی قیام گاہ پر پہنچے، اور ورثا سے درخواست کی کہ مولوی صاحب کے لئے ہمیں اپنے رسم و رواج کے مطابق دُعا مراسم ادا کرنے کی اجازت دی جائے، اُن کا اصرار اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ اُن کے مطالبہ کو تسلیم کرنا ہی پڑا۔ مولوی محمد ابراہیم صاحب نے مرحوم کی وصیت کے مطابق میت کو

غسل دیا، نماز جنازہ بھی انہیں نے پڑھائی، جب جنازہ روانہ ہوا تو سکھ اور ہندو بھی مسلمانوں کے ہمراہ تھے عیسائی پہلے ہی قبرستان پہنچ چکے تھے ان سب نے اپنے طریقہ اور مسلک کے مطابق دعا کی۔

اُستاد کی عظمت

۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے، جب ڈاکٹر صاحب انارکلی والے مکان میں رہتے تھے، سیّد محمد عبداللہ اُن سے ملنے کے لئے وہاں گئے، ڈاکٹر صاحب اُن سے فرمانے لگے۔

"عبداللہ جی یورپ کا کوئی ایسا بڑا عالم یا فلسفی نہیں ہے
ORIENTAL AND OCCIDENTAL
مُستشرق یا مستغرب جس سے میں نہ ملا ہوں، یا
کسی نہ کسی موضوع پر بے جھجک بات نہ کی ہو ؛
لیکن نہ جانے کیا بات ہے شاہ جی (میر حسن صاحب)
سے بات کرتے ہوئے میری قوّت گویائی جواب
دے جاتی ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اُن کے
کسی نقطہ نظر سے مجھے اختلاف ہوتا ہے، لیکن
دل کی یہ بات بآسانی زبان پر لا نہیں سکتا۔"

ایک بار ڈاکٹر صاحب کو یہ کہتے بھی سُنا گیا ——————

"شاہ جی کا کیا کہنا، شاہ جی کی ہر بات شعر ہوتی ہے"

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے اُستاد کا کس قدر احترام کرتے تھے اور ان کے لئے ڈاکٹر صاحب کے دل میں کتنی محبت، عظمت اور عقیدت تھی۔

طالب نہیں مطلوب

آج اسکولوں اور کالجوں کا زمانہ ہے، اب سے ستر اسی سال پہلے مکتبوں اور مدرسوں کا دور تھا، ڈاکٹر محمد اقبال کی تعلیم کا آغاز بھی ایک مکتب سے ہوا، مولوی غلام حسین محلہ سیالکوٹ کے محلہ شوالہ کی مسجد میں خطیب اور امام تھے، اور چھوٹے بچوں کو بھی پڑھاتے تھے، ایک دن مولوی میر حسن صاحب، مولوی غلام حسین سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے، غلام حسین صاحب مکتب میں بچوں کو پڑھا رہے تھے۔

مولوی میر حسن کی نظر اقبال پر پڑی، اور پہلی نگاہ ہی میں انہوں نے محسوس کیا کہ

بالائے سرش ز ہوشمندی

می تافت ستارۂ بلندی

مولوی غلام حسین سے انہوں نے پوچھا کہ یہ کس کا بچہ ہے، اس کا کیا نام ہے؟

مولوی غلام حسین نے جواب دیا، یہ شیخ نور محمد کا لڑکا محمد اقبال ہے ـــــ اس واقعہ کے ایک دو دن بعد مولوی میر حسن کی ملاقات شیخ نور محمد سے ہوئی، انہوں نے شیخ صاحب سے کہا کہ آپ اپنے لڑکے کو شوالہ کے مکتب میں پڑھنے کے لئے بھیجتے ہیں، اب اُسے آپ میرے پاس بھیجیں، میں اُسے پڑھاؤں گا۔

شیخ نور محمد مولوی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے اقبال

کو مولوی غلام حسین کے یہاں سے اٹھا لیا، شوالہ کے مکتب میں جانا موقوف ہو گیا، اور اب وہ مولوی میر حسن کے یہاں پڑھنے کے لئے جانے لگے۔

مولوی میر حسن صاحب کی جوہر شناسی بھی قابلِ تحسین و ستائش ہے کہ انہوں نے اقبال کو بچپن ہی میں اپنی خداداد فراست سے پہلی نظر ہی میں دیکھ کر، اندازہ کر لیا کہ یہ جوہرِ اقبال مستقبل میں "بہت کچھ" بننے والا ہے۔ نبیوں اور رسولوں کی تربیت و تعلیم براہِ راست اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مگر دوسری بڑی شخصیتیں شروع ہی سے مناسب تربیت اور موزوں تعلیم کی محتاج ہوتی ہیں، اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کا ظہور ہے کہ اُن کو آغاز ہی سے لائق معلم اور اچھے مربی مل جاتے ہیں۔

تعلیم و تربیت کا واقعہ اس پہلو سے خاص طور سے محلِ غور و فکر ہے کہ عموماً شاگرد، استادوں کی جستجو کرتے ہیں مگر یہاں شاگرد کا انتخاب اُستاد نے کیا، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اقبال اپنے اُستاد مولوی میر حسن کے طالب نہیں، مطلوب تھے۔

تصانیف کی مقبولیت

ڈاکٹر محمد اقبال کا شمار دُنیا کے ان چند خوش نصیب مصنفین میں کیا جا سکتا ہے۔ جن کی تصانیف اس محدود تعلیم یافتہ آبادی کے علاقہ میں سینکڑوں اور ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں شائع اور فروخت ہوئیں، اور آج تک اُن کی اسی طرح مانگ ہے ڈاکٹر صاحب کی کتابوں کو لوگ فخر کے ساتھ اپنی الماریوں اور کتب خانوں میں رکھتے ہیں

اور شادیوں میں اقبال کی کتابوں کے سیٹ تحفہ کے طور پر دیے جاتے ہیں۔

ذیل میں ڈاکٹر صاحب کی تصانیف کی باقاعدہ تصدیق شدہ تفصیل پیش کی جا رہی ہے، اس تعداد میں وہ کتابیں شامل نہیں ہیں، جو کاپی رائٹ کے قانون کا لحاظ کئے بغیر اندرون و بیرون ملک شائع کی جاتی رہی ہیں۔ اور یار لوگوں نے ہزاروں روپے اُن سے کمائے ہیں۔ اس تفصیل میں ڈاکٹر صاحب کی تصانیف کے اُن ترجموں کی تعداد بھی شامل نہیں ہے، جو انگریزی، فارسی، عربی، ترکی اور بنگالی زبانوں میں شائع کئے جا چکے ہیں۔

"ایران میں فلسفۂ الٰہیات کا ارتقا" THE DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA

یہ وہ مقالہ ہے جو انہوں نے ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء کے قیام یورپ کے زمانے میں مکمل کیا، اور اس پر انہیں میونک یونیورسٹی سے پی، ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ اس وقت جو نسخہ دستیاب ہو سکا ہے وہ جناب ممتاز حسن صاحب سابق سکریٹری مالیات حکومت پاکستان حال مینیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بنک آف پاکستان کی سعی بلیغ سے دستیاب ہوا ہے۔ بڑی بے انصافی ہوگی اگر اس موقع پر ایک اہم واقعہ کو نظر انداز کر دیا جائے۔

اقبال اکادمی کے سربراہ اور علامہ مرحوم کے مداح جناب ممتاز حسن نے اس کتاب کی اشاعت میں بڑی جستجو سے کام لیا۔ انہوں نے جرمنی میں قائم شدہ بین الاقوامی ثقافتی ادارہ INTERNATIONES BONN کے سربراہ اور نگران اعلیٰ ڈاکٹر رچرڈ مونگ DR. RICHARD MONNIG سے بذریعہ خط و کتابت رابطہ قائم کیا کہ وہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے THESIS کا اصل مسودہ تلاش کریں۔ جس کے لکھنے پر انہیں میونک یونیورسٹی سے پی، ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی، ڈاکٹر رچرڈ نے ۵۰-۶۰ سال پرانے مسودہ کی تلاش میں بڑی سرگرمی سے کام لیا۔ حتیٰ کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے اصل مسودہ کی ۵۰ کاپیاں طبع کرا کے ممتاز حسن صاحب کو روانہ کیں، جس کی ایک کاپی مصنف "روزگارِ فقیر" کو بھی دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ نیک نفس جرمن عالم ڈاکٹر صاحب کے THESIS کے مسودہ کی تلاش میں اس قدر خلوص اور فیاضانہ سرگرمی، اور جناب ممتاز حسن ان کے ساتھ گہرا ربط قائم نہ رکھتے تو نہ صرف یہ شاہکار مسودہ گوشۂ گمنامی میں پڑا رہتا، بلکہ ڈاکٹر صاحب کی تاریخ پیدائش کا مسئلہ بھی لاینحل رہتا۔ چونکہ یہی وہ کتاب ہے جس کے سرنامہ پر انہوں نے اپنی تاریخ پیدائش خود درج کی ہے۔

۲- ڈاکٹر صاحب کی ایک اور تصنیف

RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM

۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی، ہوا یہ کہ مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف ساؤتھ انڈیا نے ۱۹۲۸ء میں اپنے اہتمام سے ایک مذاکرہ منعقد کیا، جس میں ڈاکٹر صاحب نے مدراس میں چھ لیکچر اسلام پر دیئے جو اُردو دُنیا میں "خطباتِ مدراس" کے نام سے مشہور ہوئے، اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ، ڈاکٹر صاحب کی اپنی اس رائے سے ہو سکتا ہے۔

"اگر یہ کتاب خلیفہ مامون الرشید کے دور میں شائع ہوتی
تو یقیناً اسلامی دُنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے کا
ذریعہ بن جاتی۔"

ڈاکٹر اقبال کے یہ خطبات فلسفیانہ انداز بیان میں لکھے گئے ہیں، ان میں نظر کی بلندی اور فکر کی گہرائی بے انتہا ہے۔ ہر مسئلہ خالص فلسفیانہ اور عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لئے زبان و بیان کا شاہکار ہونے کے باوجود یہ خطبات* عام فہم نہیں ہیں

ڈاکٹر اقبال کی اس معرکہ آرا تصنیف کا محدود تعداد میں شائع ہونا اس کی دلیل ہے۔ کہ قوم ناولوں اور افسانوں کے چٹخاروں میں مبتلا ہے اور علمی ذوق مفقود ہوتا جا رہا ہے، لوگ فکر انگیز بلند معیار کتابوں کے مطالعہ سے جی چراتے ہیں۔

۳۔ اسرار خودی: ڈاکٹر صاحب کے اشعار کا یہ پہلا مجموعہ ۱۹۱۵ء میں لاہور سے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا۔ اسی مثنوی کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب پہلی بار اپنے "فلسفہ خودی" کو منظر عام پر لائے، جو دیکھتے ہی دیکھتے ہند اور بیرون ہند کے علماء کی توجہ کا مرکز بن گیا، یہاں تک کہ مشہور مستشرق پروفیسر نکلسن نے اس کا انگریزی ترجمہ کر کے انگلستان میں شائع کیا، مشہور نقاد لے ایم فارسٹر اور پروفیسر ڈکنسن نے اسرار خودی پر جو محققانہ تبصرے شائع کئے، اُن کے توسط سے ڈاکٹر صاحب مشرق کے عظیم فلسفی شاعر کی حیثیت سے یورپ میں متعارف ہوئے۔

۴۔ رموز بے خودی: مثنوی اسرار خودی کا دوسرا حصہ "رموز بے خودی" ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا، اور "اسرار خودی" کی طرح بہت مقبول ہوا، بعض اہل علم اور

---

* ان کی اردو شرح ایک بڑی قومی ضرورت ہے، اور راقم الحروف اس ضرورت کو پورا کرنے میں گہری دلچسپی لے رہا ہے

ارباب فکر نے تو اسے نقش ثانی سمجھا، بعد میں یہ دونوں مثنویاں یکجا صورت میں بھی شائع ہوتی رہیں۔

۵۔ پیام مشرق: ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۳ء تک ڈاکٹر صاحب کے فارسی کلام کے جو مجموعے شائع ہوئے "پیام مشرق" اُن میں تیسرا مجموعہ تھا، جو مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے "پیغام مغرب" کے جواب میں منظوم و مرتب کیا گیا، اور جس نے مغرب میں پہنچ کر وہاں کی علمی فضا میں ہل چل پیدا کر دی۔

انہی دنوں ڈاکٹر صاحب کے عزیز و محترم دوست نواب سر ذوالفقار علی خاں نے ایک انگریزی کتاب:۔

VOICE FROM THE EAST OR POETRY OF IQBAL

شائع کر کے بڑی تعداد میں انگلستان بھجوائی اور اس طرح یورپ میں ڈاکٹر صاحب کے افکار و نظریات کو تعارف، شہرت اور اشاعت کے نئے مواقع ملے۔

ذیل میں ڈاکٹر صاحب کی باقی تصانیف کا ابتدائی سن اشاعت اور تعداد اس ترتیب سے دی جا رہی ہے جس تدریج سے وہ یکے بعد دیگرے شائع ہوئی ہیں۔

اسرار خودی	۱۹۱۵ تا ۱۹۵۹	۶ ایڈیشن	۱۳۰۰۰ تیرہ ہزار
پیام مشرق	۱۹۲۳ تا ۱۹۵۸	۹ ایڈیشن	۱۸۰۰۰ اٹھارہ ہزار
بانگ درا	۱۹۲۴ تا ۱۹۶۲	۲۱ ایڈیشن	۱۱۴۰۰۰ ایک لاکھ چودہ ہزار
زبور عجم	۱۹۲۷ تا ۱۹۵۹	۷ ایڈیشن	۱۶۴۰۰ سولہ ہزار چار سو

جاوید نامہ	۱۹۳۲ تا ۱۹۵۹	۴ ایڈیشن	۶۰۰۰	چھ ہزار
بالِ جبریل	۱۹۳۵ تا ۱۹۶۲	۱۲ ایڈیشن	۶۲۰۰۰	باسٹھ ہزار
پس چہ باید کرد / اے اقوامِ شرق	۱۹۳۶ تا ۱۹۵۹	۴ ایڈیشن	۱۱۰۰۰	گیارہ ہزار
ضربِ کلیم	۱۹۳۶ تا ۱۹۵۹	۱۰ ایڈیشن	۴۳۰۰۰	تینتالیس ہزار
ارمغانِ حجاز	۱۹۳۸ تا ۱۹۵۹	۷ ایڈیشن	۲۲۰۰۰	بائیس ہزار

۳۰۵,۴۰۰

تین لاکھ پانچ ہزار چار سو

سیرتِ اقبال کی چند جھلکیاں

ڈاکٹر صاحب کے حالات کا تذکرہ نامکمل رہے گا، اگر اُن کی روزمرّہ زندگی مشاغل خوراک، رہائش، لباس، کاروباری وسائل، میل ملاقات اور معیارِ اخلاق کی جھلکیاں پیش نہ کی جائیں، اپنے طویل مشاہدہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ ملک گیر بلکہ آفاق گیر شہرت رکھتے تھے، اُن کی شخصیت بہت عظیم المرتبت تھی، لیکن ان کی ذاتی زندگی مردِ درویش و قلندر کی مانند تھی۔ سیدھی سادی معاشرت، کوئی تصنع نہیں کسی قسم کا کرّوفر نہیں مکان کے در و دیوار آرائش سے عاری، ہر شخص اُن تک کسی دشواری کے بغیر پہنچ سکتا تھا۔ آرائش اور نمائش کی طرف اُن کی نگاہ ہی نہیں جاتی تھی، اُن کی زندگی ایک صابر اور متوکل مسلمان کی زندگی اور اُن کا عمل اُن کے فکر و نظر کا نمونہ تھا۔



جاوید منزل، علامہ اقبال روڈ لاہور جہاں شاعرِ مشرق نے زندگی کے آخری تین سال گذارنے کے بعد داعیِ اجل کو لبیک کہا

اپنی اس قلندرانہ وضع کو انہوں نے آخر دم تک ختم ہونے نہیں دیا۔

اقبالیات کا کوئی طالب علم اگر اُن کی نجی زندگی کے اجنبی اور مانوس گوشوں پر تحقیق کرنے نکلا، تو اُسے اقبال کی شخصیت صاحبِ کردار انسان اور راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے بھی اُسی رفعت و سربلندی پر نظر آئے گی، جو عظمت اور امتیاز اُسے بحیثیت فلسفی شاعر، اور دانائے راز حاصل ہے، یہ زندگی جا بجا ایسی جھلکیوں سے آراستہ اور ایسی مثالوں سے پیراستہ ہے۔ جو عاشقانِ رسول اور شیدائیان اسوہ حسنہ کا خاصہ تو ہو سکتی ہیں اور کسی کا نہیں؛ اقبال دین کے معاملہ میں چون و چرا کے قائل نہ تھے۔ اللہ اور رسولؐ کے حکم کی کامل اطاعت اُن کا عقیدہ اور ایمان تھا، علامہ اقبال اُس "عقل" کے مخالف تھے جو ایک طرف تو منافق اور مصلحت شناس ہوتی ہے اور دوسری طرف دین کے احکام کی اطاعت کے لیے دلیلیں طلب کرتی ہے، اسی "عقل" کو اقبال نے جا بجا قابلِ ملامت ٹھہرایا ہے۔

وہ ایسے مسلمان تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاکِ پا کو سرمۂ چشم بصیرت اور اکسیر و کیمیا سمجھتے تھے۔ اُن کا دل گداز اور ضمیر بیدار تھا ـــــــ

رہائش

ڈاکٹر صاحب ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک بھاٹی دروازے کے اندر، اکتوبر ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۲ء تک انارکلی میں، ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۵ء تک میکلوڈ روڈ پر اور ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء تک میورروڈ (موجودہ اقبال روڈ) والے مکان میں مقیم رہے، صرف یہ آخری مکان ـــــــ جاوید منزل ـــــــ اُن کی ذاتی ملکیت تھی باقی سب کرائے کے تھے، ان تمام اقامت گاہوں

میں اُن سے ملنے جُلنے والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دُنیا کا سب سے بڑا شاعر نہ تو قیمتی صوفوں پر بیٹھتا تھا، نہ اُس کا مکان دیدہ زیب فرنیچر سے آراستہ تھا، نہ اُس کے یہاں ایرانی قالین تھے، بالکل عام اور سادہ رہائش ہر قسم کے تکلف اور امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے یکسر پاک؛ نہ نوکروں اور دربانوں کی فوج، نہ ملاقات کے لئے رسمی پابندیاں؛ ملاقاتیوں کے بارے میں ڈاکٹر صاحب غریب و امیر اور جاہل و تعلیم یافتہ کا کوئی امتیاز بھی روا نہ رکھتے تھے، ان آنکھوں نے یہ سماں دیکھا ہے کہ تانگہ والے نے باہر تانگہ روکا، اندر آیا، سلام کر کے نیچے بیٹھ گیا، اور ڈاکٹر صاحب کے پاؤں دباتا رہا، چند منٹ بعد اُٹھا اور چلا گیا۔ موچی گیٹ اور بھاٹی گیٹ کے کسی اکھاڑے کا پہلوان آیا ہے اپنے کرخت اور بے جھجک لہجہ میں ڈاکٹر صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا ہے اور ڈاکٹر صاحب ہیں کہ اُس کی باتیں خاموشی سے سُن رہے ہیں پیشانی پر شکن تک نہیں آتی۔

ایک بار ایک دھوبی آیا، ڈاکٹر صاحب کا وفادار اور قدیم ملازم علی بخش دروازے پر کھڑا تھا وہ کہنے لگا "میں ڈاکٹر اقبال کو دیکھنا چاہتا ہوں" ڈاکٹر صاحب بنیان پہنے دُھوتی باندھے صحن میں حُقہ پی رہے تھے، علی بخش نے اشارے سے کہا ـــــ "یہ ہیں ڈاکٹر صاحب" دھوبی کو علی بخش کے کہنے کا یقین نہیں آیا، وہ آگے بڑھا اور ڈاکٹر صاحب کو گھر ہی کا کوئی معمولی آدمی سمجھ کر اُن سے پوچھنے لگا، ڈاکٹر اقبال کہاں ہیں، میں اُنہیں دیکھنا چاہتا ہوں؛ ڈاکٹر صاحب اس پر مسکرائے اور کہا ـــــ بھئی میں ہی ہوں آؤ بیٹھو ـــــ دھوبی سکتہ میں آگیا ـــــ اتنا سادہ اور بے نیاز؛

شہرت شہنشاہ جیسی، رہائش درویش جیسی!!

لباس

ڈاکٹر صاحب بس ضرورت کے مطابق کپڑے سلواتے تھے، نہ فالتو جوڑے رکھتے اور نئے نئے ڈیزائن کے کپڑے خریدنے کا بھی اُنہیں شوق نہ تھا، ہوتا یہ کہ جب کپڑے ختم ہو جاتے تو علی بخش سے ذکر فرما دیتے، علی بخش ایک اَن پڑھ اور پُرانی وضع کا سیدھا سادہ ملازم تھا، وہ اپنی پسند کا کپڑا بازار سے جا کر خرید تا۔ اور درزی کے سپرد کر آتا یا کبھی اُس درزی سے ہی کہہ دیا جاتا جس کے پاس اُن کے ناپ موجود تھے، درزی کپڑے تیار کر کے ڈاکٹر صاحب کو پہنچا دیتا۔ ڈاکٹر صاحب کسی کپڑے کی وضع قطع، تراش اور سلائی پر کوئی اعتراض نہ کرتے، اور نہ کسی قسم کی تنقید فرماتے، اور اوّل تو دھوتی اور بنیان کی موجودگی میں کپڑے پہننے کی نوبت ہی کم آتی تھی، گھر پر شلوار صرف سردیوں میں پہنتے، گرمی میں ہمیشہ ۵ گز کی کنی دار دھوتی کو دوہرا کر کے تہبند کی طرح باندھ لیتے، جاڑوں میں قمیص اُس پر دُھسا یا گرم چادر۔

پروفیسر سلیم چشتی اس کے راوی ہیں کہ اُنھوں نے چودہ سال کی مدت میں صرف تین مرتبہ ڈاکٹر صاحب کو کوٹ پہنے دیکھا، پہلی مرتبہ ۱۹۲۶ء میں جب کونسل کے انتخاب کے سلسلہ میں انھوں نے بادلِ ناخواستہ انار کلی کے جلوس میں شرکت کی تھی، دوسری مرتبہ ۱۹۳۵ء میں جب وہ جاوید اقبال کی والدہ کی تدفین کے لئے قبرستان گئے تھے، اور تیسری بار ۱۹۳۶ء میں، انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسہ میں۔ بادامی شوز بغیر پالش، تین گز کی شلوار، ٹوئل کی سفید قمیص، گیرون کا کوٹ اور لدھیانے کی نیلی سلائی دار ہ گز کی سوتی پگڑی،

یہ تھی لباس کی سج دھج اُس شخصیت کی جس کی شہرت کا مشرق و مغرب میں ڈنکا بج رہا تھا، اور کروڑوں قلوب جس کے احترام سے معمور تھے۔ زندگی کے آخر دور ۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۸ء میں وہ لباس کی طرف سے اور بے پروا ہو گئے تھے، اس کتاب کے آغاز کی تصویر میں ڈاکٹر صاحب جو اچکن پہنے نظر آتے ہیں اس سے دلچسپ واقعہ منسوب ہے کہ حیدر آباد دکن کے وزیر اعظم مہاراجہ سر کرشن پرشاد نے شیروانیوں کے لئے جامہ وار کے دو ٹکڑے تحفہ کے طور پر ڈاکٹر صاحب کو دیئے تھے ایک کی اچکن ڈاکٹر صاحب نے خود بنوائی اور دوسرا ٹکڑا شیخ اعجاز احمد کو دیا۔ جو ان کے پاس اب تک محفوظ ہے۔

خوراک

عنفوانِ شباب کے بعد ڈاکٹر صاحب کو عمدہ قسم کے کھانوں اور زبان کے چٹخاروں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی، علی بخش اُن کا پرانا خادم جو ابھی بقیدِ حیات ہے۔ ان کے لئے ایک سالن اور دو پھلکے پکا دیتا۔ وہ عام طور پر دوپہر کو کھانا کھاتے، رات کا کھانا ناغہ کر دیتے لیکن جس دن اتفاق سے دوپہر کا کھانا نہ کھاتے اُس دن رات کو کھانا تناول فرماتے اُن کا دن رات میں ایک بار کھانے کا معمول ایک دو سال نہیں کم و بیش ۲۰ - ۲۵ سال قائم رہا۔ جب تک اندرون بھاٹی گیٹ اُن کا قیام رہا، رات کو عموماً دُودھ پی لیا کرتے تھے۔ بعد میں یہ معمول بھی منقطع ہو گیا، انگور، آم اور خربوزے بڑے شوق سے کھاتے جب حکیم نابینا نے گلے کی تکلیف میں سردہ ان کے لئے تجویز کیا، تو حکومت افغانستان کی جانب سے انہیں سردے بھیجے جاتے اکبر الٰہ آبادی انہیں آم بھیجتے، لیکن ان مرغوب پھلوں کے لئے خود کوئی اہتمام نہ کیا جاتا تھا۔

حقہ ان کی زندگی کا بہترین ساتھی تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ وہ تو موجود ہوں اور حقہ ان کے پاس موجود نہ ہو، علی بخش کو بھی سب سے زیادہ ان کے حقہ کا ہی خیال رکھنا پڑتا۔ جب کسی دوست کے ہاں تشریف لے جاتے، تو ان کی سب سے بڑی تواضع یہی سمجھی جاتی اور میزبان سب سے پہلے اسی کی فکر کرتا ——

آمدنی

عام طور پر جو یہ مشہور ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی شہرت اور مقبولیت کے بہترین دور میں بھی اُن کی ذاتی آمدنی ایک ہزار روپے ماہانہ سے کبھی نہیں بڑھی —— تو یہ بات واقعی درست ہے۔ لیکن اُن کے مالی حالات کے پس منظر پر غور کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ کیا آج کی دنیا میں انسان اتنے سخت اور بے لچک اصولوں پر قائم رہ سکتا ہے۔ یہ محض سنی سنائی باتیں نہیں ہیں بلکہ یہ واقعات اور حقائق ہیں، اور علی بخش اس کے عینی شاہد کی حیثیت سے موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب جس زمانہ میں بیرسٹری کرتے تھے تو عام طور پر ان کے مقدمات قبول کرنے کی آخری تاریخ ہر مہینہ کی دس ہوتی تھی، اُس وقت ڈاکٹر صاحب کے ماہانہ اخراجات جس میں منشی طاہرالدین اور علی بخش کی تنخواہ اور مکان کا کرایہ سب کچھ شامل تھا، سات سو روپے کے لگ بھگ تھے۔ جب اتنی رقم کے معاوضہ کے مقدمات آجاتے تو مزید مقدمات لینے سے انکار کر دیتے بعض موکل اصرار کرتے کہ ہمارے مقدمہ کی وکالت آپ ہی کو کرنا ہوگی تو ڈاکٹر صاحب انہیں مشورہ دیتے کہ آنے والے مہینہ کی شروع کی تاریخوں میں آنا۔

محدود آمدنی کے باوجود ڈاکٹر صاحب انکم ٹیکس[1] ادا کرنے کے معاملہ میں راست باز اور فرض شناس تھے، اُنہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ انسان طمع اور حرص کے شکنجے میں پھنس کر انسان ہی نہیں رہتا، اور اس کے اندر بہت سی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں لالچی لوگ تنگ نظر اور خود غرض بھی ہوتے ہیں۔ پھر حرص و ہوس ایسی بیماری ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے، ظاہر ہے کہ یہ باتیں انہی لوگوں کے دل و دماغ میں محفوظ رہ سکتی ہیں، جن کو رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا یہ ارشاد یاد ہو —— کہ

"دُنیا کی سب سے بڑی دولت قناعت ہے"

دیانت و امانت اور قناعت و استغنا ہی وہ جوہر ہیں جو ایک دنیا دار انسان کو حق تعالیٰ کے قریب لے جاتے ہیں؛

ڈاکٹر صاحب نے سچ مچ اپنے پائے قناعت میں توکل کی حنا باندھ لی تھی، ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی کو کس ڈگر پر ڈالا تھا، اس کا بہت کچھ اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب اُن کے سیالکوٹ کے مکان کی بیع ہوتی ہے۔ تو اُس موقعہ پر فریق ثانی دستاویز میں شفعہ کے مقدمہ کے خوف سے زائد مفروضہ رقم درج کرنے کے لئے اصرار کرتا ہے۔ (اور شفعہ کا مقدمہ کامیاب بھی ہو جاتا ہے) مگر ڈاکٹر صاحب کسی طرح اس فرضی اور خیالی اندراج پر آمادہ نہیں ہوتے، اپنا نقصان گوارا کر لیتے ہیں مگر غلط بیانی گوارا نہیں کرتے؛ روپیہ پیسہ اپنی تمام متنوع طلسمی کشش کے باوجود، ڈاکٹر اقبال کو اپنی طرف نہ کھینچ سکا۔

---

[1] متعلقہ فائل محکمۂ انکم ٹیکس میں ابھی تک محفوظ ہے۔

بیماریاں

اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے، اپنی حکمتیں اور اُن کے رموز وہی جانتا ہے، بندہ کا کام تو اطاعت و فرمانبرداری، ہر حالت میں اُس کا شکر ادا کرنا اور صبر اختیار کرنا ہے، ڈاکٹر صاحب کو یکے بعد دیگرے اتنی بیماریاں لاحق ہوئیں کہ زندگی اجیرن ہو گئی، مگر ان بیماریوں کے باوجود اُن کی زندگی کے معمولات میں سرِ مُو فرق نہیں آیا، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مسلسل علالتوں نے اُن کے مزاج کی سنجیدگی کو متغیر نہیں کیا، ورنہ عام طور پر مریضوں کو دیکھا گیا ہے کہ بیماری اُنہیں چڑچڑا بنا دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب تبخیرِ معدہ اور بدہضمی کے پُرانے مریض تھے، سوڈے کی بوتلیں ان کے یہاں ہمیشہ رہتیں، یہاں تک کہ سیالکوٹ تشریف لے جاتے، تو وہاں بھی سوڈے کی بوتلوں کا اہتمام ہوتا، پھر نقرس کا حملہ ہوا، درد گردہ کی شکایت ہوئی، ضیق النفس کے سبب آواز بیٹھ گئی، بے چینی اور کرب نے مستقل رفاقت اختیار کر لی، آخر عمر میں بصارت بھی بڑی حد تک جواب دے گئی، مگر بیماریوں کے حملوں نے اُن کی حوصلہ مندی، ثابت قدمی اور خوش ذوقی میں فرق نہ آنے دیا۔ بیماریوں سے دل گرفتہ ہونا جیسے انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ ذرا طبیعت سنبھلتی تو وہی احباب کی محفلیں علمی مباحثے، سیاست، مذہب، فلسفہ، منطق، تاریخ اور تصوّف ان میں سے ہر موضوع پر نئے اور پُرانے ملاقاتی اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر تبادلہ خیال کرتے اور علمی تشنگی بجھاتے۔ اُن کی وضعداری اور مشرقی شرافت اور طبیعت کی یک رنگی کا یہ عالم تھا کہ جسے ایک بار زبان سے "دوست" کہہ دیا، اُسے ساری عمر دوست سمجھا، اور پہلے دن جس انداز میں اُس سے ملے آخر عمر تک ملنے جُلنے کی اس روش کو نباہا اور باقی رکھا۔

ڈاکٹر صاحب کے کم و بیش ہزاروں احباب و شناسا ایسے تھے، جو پُورے ملک میں دُور و نزدیک پھیلے ہوئے تھے، مگر اُن کے دل سے قریب تھے "از دیدہ دور از دل دُور" ڈاکٹر صاحب کا یہ مسلک ہی نہ تھا۔ شناسائی اور دوستی کے تعلقات کا وہ بہت لحاظ رکھتے تھے۔

اُن کے احباب اور جاننے والوں میں مؤرّخ اور شاعر بھی تھے، صحافی، اور علماء دین بھی تھے، اعلیٰ افسران بھی تھے، اور اساتذہ بھی، ڈاکٹر صاحب کی ذات سے کسی دوست کو کوئی رنج نہیں پہنچا، اُن کا ہر ملنے والا یہی سمجھتا کہ ڈاکٹر صاحب مجھ پر سب سے زیادہ کرم فرماتے ہیں، احباب کی دل شکنی اُنہیں کسی حال میں گوارا نہیں تھی، ڈاکٹر صاحب جانتے تھے کہ یہ نازک آبگینے ذرا سی ٹھیس سے چکنا چور ہو جاتے ہیں اُن کی ذات محبت اور دردمندی کا سرچشمہ تھی۔

آخر عمر میں وہ بالکل نڈھال ہو گئے تھے، بیماریوں کے حملوں پر حملے، مگر اس نقاہت اور ناتوانی کے عالم میں بھی پابندی کے ساتھ کسی تاخیر کے بغیر خطوں کا جواب دیتے، جب لکھنے کی طاقت نہ رہی، تو دوسروں سے خطوں کا جواب لکھواتے، کسی کو بے جا زحمت اٹھانے دینا یا کبیدہ خاطر کرنا بہرحال گوارا نہ تھا۔

مُلک کے مستقبل کے مسائل پر غور و فکر، سیاسی مصروفیات ملّتِ اسلامیہ کی یکجہتی کے لئے جدوجہد اس سے وہ بیماری کے زمانے میں بھی غافل نہیں رہے، دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں انگلستان سے شدید بیمار ہو کر واپس آتے ہیں، اور پھر تیسری

کانفرنس میں بھی شرکت کے لئے جاتے ہیں، سوز و جذب، دردمندی، قومی غیرت اور جذبۂ ایمانی ان عناصر سے اُن کے مزاج کی تشکیل ہوئی تھی۔

انجمن حمایتِ اسلام

انجمن حمایتِ اسلام (لاہور) کو وہ مسلمانوں کی تنظیم و تعلیم اور اشاعتِ دین کا موزوں پلیٹ فارم اور ذریعہ سمجھتے تھے، اس لئے اس کے ساتھ ایک بار جو تعلق قائم ہُوا اُسے مرتے دم تک منقطع نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے پہلی بار انجمن کے جلسہ عام میں اپنی مشہور نظم "نالۂ یتیم" پڑھی۔ پہلے انجمن کے سیکرٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد انھیں انجمن کا صدر منتخب کیا گیا۔ حتّٰی کہ شدید علالت اور معذوری کے سبب انجمن کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ مستعفی ہونے سے پہلے تک یہ کیفیت رہی کہ کمزوریٔ بصارت کے سبب پڑھنے میں دقت ہوتی تو انجمن کے کاغذات پڑھوا کر سُنتے اور ان پر نوٹ اور ضروری احکام لکھوا کر دستخط کرنے کی بجائے اپنے نام کی مُہر لگواتے، انجمن کے جلسوں میں پابندی کے ساتھ بالالتزام شرکت اور اپنی تازہ نظم پڑھنا، یہ اُن کا معمول رہا۔ انجمن حمایتِ اسلام کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُس کے پلیٹ فارم سے حکیمِ مشرق نے بارہا اپنی نظمیں پڑھیں، اُن کی شہرہ آفاق نظم "شکوہ" بھی اسی انجمن کے سالانہ اجلاس میں اُن کی زبان سے سُنی گئی۔ ڈاکٹر صاحب آخری بار ۱۹۳۶ء میں انجمن کی سالانہ کانفرنس میں شریک ہوئے، مگر ناتوانی اور خرابیٔ صحت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ خود نظم سنانے کے قابل نہ تھے۔ اُن کی یہ نظم جس کا پہلا مصرعہ ہے:

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ

ایک اور صاحب نے پڑھ کر سنائی۔

ڈاکٹر صاحب انجمن کی صدارت سے مستعفی ہونے کے باوجود، انجمن کی فلاح و بہبود کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہے، انہوں نے انجمن کے ساتھ اپنے تعلقات کو جس طرح قائم رکھا اور نباہا ہے، وہ اُن کے کردار کا ایک نمایاں اور سبق آموز پہلو ہے، انتقال سے قبل جو وصیت کی، اس میں اپنا ذاتی کتب خانہ انجمن حمایتِ اسلام کے قائم کردہ اسلامیہ کالج کی لائبریری کو عطیہ کے طور پر دینے کی ہدایت درج فرمائی۔ یہی کتابیں زندگی بھر کا سرمایہ اور سارا اثاثہ تھیں۔ ایک مردِ درویش کسی ادارہ کو اس سے بہتر خراج کیا پیش کر سکتا ہے

اقبال عظیم شاعر تو تھے ہی، مگر وہ بحیثیت انسان بھی بہت بڑے تھے، اُن کی عالی ظرفی کا یہ عالم تھا کہ علالت کے زمانے میں نواب بھوپال اور سر آغا خاں کی جانب سے پانچ پانچ سو ماہوار کے وظائف کی پیشکش کی جاتی ہے تو وہ آغا خاں کا وظیفہ یہ کہہ کر واپس کر دیتے ہیں کہ انہیں پانچ سو روپیہ ماہانہ سے زیادہ خرچ کرنے کی عادت نہیں ہے۔ توکل اور قناعت کی یہ صفت صوفیائے کرام کا طغرائے امتیاز رہی ہے۔ جب نادر شاہ افغانستان میں سیاسی ہنگامہ آرائی فرو کرنے کے لئے لاہور اسٹیشن سے گزرتے ہیں، تو ڈاکٹر صاحب اپنی تمام جمع پونجی لے کر پہنچتے ہیں اور زبانِ حال سے فرماتے ہیں:

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

ملت کے بہی خواہ، انسانیت کے غم خوار، اور شاعر و حکیم اقبال کی زندگی کا سب سے زیادہ روشن پہلو یہ ہے کہ وہ ایک سچے عاشقِ رسول بھی ہیں۔ اور حضور رسولِ مقبول کی ذاتِ اقدس سے والہانہ عشق ان کی زندگی کے ہر گوشے اور پوری شاعری پر چھایا ہوا ہے:



ڈاکٹر اقبال کا دیرینہ خادم علی بخش جس نے ۴۰ سال اُن کی خدمت کی۔

تاریخ پیدائش۔ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ

حضرت علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش عام طور پر ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء بیان کی جا رہی ہے۔ چنانچہ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے ان کی لاہور اور سیالکوٹ کی رہائش گاہوں پر جو کتبے نصب کئے ہیں۔ ان میں سن پیدائش ۱۸۷۳ء ہی لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح بزمِ اقبال لاہور نے جو کتاب "ذکرِ اقبال" کے نام سے شائع کی ہے۔ اس میں بھی تاریخ پیدائش ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء بیان کی گئی ہے۔ یہ تاریخ پیدائش درست نہیں اور ایک غلط فہمی کی بنا پر مشہور ہو گئی ہے۔ علامہ کی اصل تاریخ پیدائش ۲ ذیقعد ۱۲۹۴ھ ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت خود ان کے بیانات ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے ایک تحقیقی مقالہ "ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء" کے موضوع پر لکھا تھا جس پر جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ مقالہ کی ابتدا میں جو خود نوشت تعارفی نوٹ ہے اس میں علامہ فرماتے ہیں کہ "میں ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۶ء) کو پیدا ہوا" پھر ۲۳ سال کے بعد ۱۹۳۱ء میں جب انھوں نے انٹرنیشنل پاسپورٹ کے لئے درخواست دی تو اس میں بھی اپنا سن پیدائش ۱۸۷۶ء ہی درج کیا۔ چنانچہ اُن کے پاسپورٹ میں یہی سن پیدائش درج کیا گیا۔ یہ پاسپورٹ ڈاکٹر جاوید اقبال کے پاس اور اس کی عکسی نقول مصنف کے پاس محفوظ ہیں۔ پاسپورٹ میں سن پیدائش والے صفحہ کا عکس اس کتاب میں بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ علامہ کی وفات کے فوراً بعد روزنامہ انقلاب لاہور

نے ان کے مختصر سوانح حیات شائع کئے تھے ان میں علامہ کے برادر اکبر شیخ عطا محمد صاحب کے تخمینی بیان کے مطابق علامہ کی پیدائش کا مہینہ دسمبر اور سال ۱۸۷۶ء بیان کیا گیا جو خود علامہ کے بیان کردہ عیسوی سن پیدائش سے مطابقت رکھتا ہے۔

تاریخ پیدائش کے متعلق غلط فہمی کی ابتدا روزنامہ انقلاب کی اشاعت مورخہ ۹ مئی ۱۹۳۸ء سے ہوئی۔ اس میں "علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش" کے عنوان کے تحت حسب ذیل نوٹ شائع کیا گیا:۔

"حضرت علامہ اقبال کے جو مختصر سوانح حیات انقلاب کی کسی گذشتہ اشاعت میں چھپے تھے ان میں شیخ عطا محمد صاحب برادر کلاں حضرت علامہ مرحوم کے تخمینی بیان کے مطابق حضرت مرحوم کی تاریخ پیدائش دسمبر ۱۸۷۶ء بتائی گئی تھی۔ لیکن اب تحقیقی طور پر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت علامہ مرحوم ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے، اسلامی تاریخ ۲۳، ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ تھی۔ ان تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہ مرحوم کی عمر بحساب سنین شمسی ۶۵ برس دو ماہ اور بحساب قمری ۶۷ برس دو ماہ ہوئی"

نوٹ میں یہ وضاحت تو نہیں کی گئی کہ انقلاب کی "تحقیق" کا ماخذ کیا ہے، بیان کردہ تاریخ کے درست ہونے کا کوئی ثبوت بھی نوٹ میں درج نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے "انقلاب" نے سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر پیدائش میں ۱۸۷۳ء کے ایک اندراج پر انحصار کرتے ہوئے ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو علامہ کی تاریخ پیدائش بیان کیا تھا۔ اسی اندراج پر "ذکر اقبال" میں

بھی جو سالک صاحب کی مرتب کردہ سوانح ہے انحصار کیا گیا ہے۔ اس اندراج کی مصدقہ نقل کا عکس صفحہ آئندہ پر ملاحظہ فرمائیں۔ اس اندراج سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو علامہ کے والد بزرگوار شیخ نور محمد صاحب (جن کا عرف شیخ نتھو تھا) کے ہاں "ایک لڑکا" پیدا ہوا۔ لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ یہ لڑکا علامہ کے علاوہ اور کوئی نہیں یا یہ کہ اندراج علامہ کی ہی پیدائش کے متعلق ہے اس کے برعکس راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق یہ اندراج شیخ نور محمد صاحب کے ہاں ایک اور لڑکے کی پیدائش کے متعلق ہے جو علامہ سے تین چار سال پہلے پیدا ہو کر شیر خواری کی عمر میں وفات پا گیا۔ میری درخواست پر علامہ کے برادر زادہ شیخ اعجاز احمد نے اپنی ایک پھوپھی صاحبہ سے جو ابھی بفضل تعالیٰ حیات ہیں تصدیق کرائی ہے کہ علامہ کی پیدائش سے تین چار سال قبل ان کے والد کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔ جو شیر خواری کی عمر میں ہی فوت ہو گیا۔ وہ فرماتی ہیں کہ یہ بات انہوں نے اپنی والدہ صاحبہ سے ایک بار نہیں متعدد بار سنی ہے۔ یہ امر قابل افسوس ہے۔ کہ رجسٹر پیدائش کے اس اندراج کو (جو علامہ کی پیدائش کے متعلق نہیں) بغیر کافی تحقیق کے ان کی تاریخ پیدائش تسلیم کر لیا گیا اور پھر اسی کی بنا پر تاریخ پیدائش کے متعلق علامہ کے اپنے اور ان کے برادر اکبر کے واضح بیانات کو رد کر دیا گیا ہے آخر علامہ کو ۱۹۰۰ء میں اور پھر ۱۹۳۱ء میں اپنی تاریخ و سن پیدائش غلط بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ علامہ کے اپنے واضح بیانات اور ان کے برادر کلاں کے بیان کے علاوہ حسب ذیل قرائن بھی ۳ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ کی تائید اور ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کی تردید میں ہیں۔

۱۔ اگست ۱۹۳۰ء میں منشی محمد دین صاحب فوق نے ایک کتاب "مشاہیر کشمیر" شائع

کی تھی جس میں علامہ کا سن پیدائش ۱۸۷۶ء درج کیا تھا۔ دو سال بعد ۱۹۳۲ء کے آخر میں رسالہ "نیرنگ خیال" لاہور نے ایک خصوصی شمارہ "اقبال نمبر" شائع کیا جس میں منشی محمد دین صاحب فوق نے ایک مضمون "اقبال کے مختصر سوانح حیات" کے عنوان سے لکھا اور شاید پہلی مرتبہ میں بیان کردہ سن پیدائش کی تصحیح کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کا سن پیدائش وہی بیان کیا جو خود انہوں نے ۱۹۰۹ء اور ۱۹۳۱ء میں بیان کیا ہے یعنی ۱۸۷۶ء۔ فوق صاحب کے حضرت علامہ کے ساتھ گہرے تعلقات تھے یہ امر قرین قیاس ہے کہ سن پیدائش کی تصحیح فوق صاحب نے خود علامہ کی ہدایت اور ایما پر کی ہو۔

۲۔ حضرت علامہ کے برادر زادہ شیخ اعجاز احمد کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنی ایک پھوپھی صاحبہ سے جو فوت ہو چکی ہیں سُنا ہے کہ علامہ کی پیدائش جمعہ کے دن صبح چار بجے کے قریب ہوئی تھی۔ اور یہ بات ان کی پھوپھی صاحبہ نے اپنی والدہ صاحبہ سے بارہا سُنی تھی۔ ۳ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ کو جو علامہ نے اپنی تاریخ پیدائش بیان کی ہے جمعہ کا ہی مبارک دن تھا۔ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو جمعہ کا دن نہ تھا۔ بلکہ ۱۸۷۳ء سے ۱۸۷۸ء تک کوئی ۲۲ فروری بھی جمعہ کو نہیں پڑتی، اور نہ ۱۲۸۹ھ سے ۱۲۹۴ھ تک کوئی ۳ ذیقعدہ ماسوائے ۳ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ کے جمعہ کو پڑتی ہے۔

۳۔ حضرت علامہ کی زندگی میں لندن کے رائل اکادمی جرنل میں ایک انگریزی مضمون "اقبال کی شاعری" کے عنوان سے شائع ہوا جو ملک راج آنند کا لکھا ہوا تھا۔ اس میں بھی سن پیدائش ۱۸۷۶ء ہی درج ہے۔

۴۔ شیخ اعجاز احمد صاحب کی والدہ صاحبہ نے جو اب فوت ہو چکی ہیں شیخ صاحب

پاسپورٹ پر تاریخ پیدائش کے اندراج کا عکس

سے بیان کیا کہ ان کی شادی کے وقت علامہ پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے اور ان کی عمر دس بارہ سال کے درمیان تھی۔ چونکہ یہ ثابت ہے کہ علامہ نے میٹرکولیشن کا امتحان ۱۸۹۳ء میں پاس کیا لہٰذا اس حساب سے میٹرکولیشن پاس کرتے وقت علامہ کی عمر ۱۵ اور ۱۷ سال کے درمیان ہوئی، اگر تاریخ پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء ہو تو میٹرکولیشن کے وقت ان کی عمر ۲۰ سال ہو گی۔ لہٰذا شیخ اعجاز احمد صاحب کی والدہ ماجدہ کی یہ روایت بھی ۱۸۷۳ء کی تائید نہیں کرتی۔

۵۔ علامہ کی وفات کے بعد جولائی ۱۹۳۸ء میں ان کے برادر کلاں شیخ عطا محمد صاحب نے اپنے صاحبزادہ شیخ اعجاز احمد کو ایک خط علامہ کی بیوی کے متعلق لکھا جس میں بیان کیا کہ وہ یعنی علامہ کی پہلی بیوی علامہ سے دو تین سال بڑی تھیں اور اس وقت یعنی ۱۹۳۸ء میں ان کی عمر ۶۵ سال سے اوپر ہے۔ اس حساب سے ۱۹۳۸ء میں علامہ کی عمر ۶۲ یا ۶۳ سال کے قریب بنتی ہے۔ یہ روایت بھی علامہ کی بیان کردہ تاریخ کی تائید میں ہے۔

۶۔ اگر تاریخ پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء ہو تو ۵ مئی ۱۸۹۳ء کو جب انٹرنس پاس کرنے کے بعد حضرت اقبال سکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے ان کی عمر ۲۰ سال سے زائد ہونی چاہیے لیکن کالج کے رجسٹر میں ان کی عمر بوقت داخلہ ۱۸ سال لکھی ہوئی ہے جو ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کی تائید نہیں کرتی۔ یہ بات بھی قرینِ قیاس نہیں کہ علامہ ایسے ذہین اور ہونہار طالب علم نے ۲۰ سال سے زائد کی عمر میں انٹرنس پاس کیا ہو۔ علامہ اقبال کے واضح نوٹ کی موجودگی میں جو ۱۹۰۸ء میں لکھا گیا اور جس میں سن ہجری کے مطابق تاریخ مہینے اور سن تک کا تعین کیا گیا اور بعد ازاں ۱۹۳۱ء میں پاسپورٹ میں بھی سن پیدائش کے

ATTESTED

Head Clerk

SIALKOT CITY

BIRTH & DEATH CLERK
MUNICIPAL COMMITTEE
SIALKOT

متعلق اسی بیان کی تصدیق کی گئی۔ نیز ان کے برادر کلاں کے بیان کردہ سن پیدائش سے اور منشی محمد دین صاحب فوق کے ۱۹۳۲ء والے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ان کی پیدائش کی تاریخ ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ تسلیم نہ کی جائے اور ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو صحیح قرار دیا جائے۔ یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے۔ کہ ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ کے مطابق عیسوی تاریخ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے ۱۸۷۶ء نہیں۔ معلوم ہوتا ہے حضرت علامہ کو اپنی پیدائش کی تاریخ مہینہ اور سن ہجری حساب کے مطابق تو وثوق سے یاد تھے لیکن تحقیقی مقالہ کا تعارفی نوٹ لکھتے وقت جو وطن سے باہر لکھا گیا اس کی عیسوی تاریخ، مہینہ اور سن سے مطابقت نہ کی جا سکی اور ہجری تاریخ ماہ و سن کو زبانی عیسوی تاریخ و ماہ و سال میں منتقل بھی نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا انہوں نے سرسری اندازہ کر کے عیسوی سن ۱۸۷۶ء درج کر دیا! اور ان کے ذہن میں عیسوی سن پیدائش یہی قائم رہا۔ اگر حضرت علامہ کو عیسوی سن و تاریخ و ماہ یاد ہوتا تو مقالہ کے تعارفی نوٹ میں وہ تاریخ و ماہ عیسوی کا بھی ضرور اندراج کر دیتے اور صرف ۱۸۷۶ء پر ہی اکتفا نہ کرتے۔ بہر حال ہجری کے حساب سے انہوں نے تاریخ، مہینے اور سن کا تعین کر دیا ہے چونکہ ان کی بیان کردہ تاریخ پیدائش ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے، لہٰذا عیسوی سن کے مطابق تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہی صحیح ہونی چاہیے نہ کہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء۔ علامہ کی وفات پر سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے جو نوٹ شائع کیا تھا۔ اس میں بھی عیسوی سن پیدائش ۱۸۷۷ء ہی لکھا ہے۔

تاریخ پیدائش کے متعلق دو ایک اور باتوں کی وضاحت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ کوئی شک و شبہ نہ رہے۔

۱۔ حضرت علامہ کے لوح مزار پر سن پیدائش ۱۲۹۲ھ درج ہے۔ جو نہ تو علامہ کے بیان کردہ سن ہجری کے مطابق ہے نہ ہی مفروضہ اندراج میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کے مطابق۔ یہ لوح مزار افغانستان کی حکومت نے کابل سے تیار کرا کر بھیجی تھی۔ راقم الحروف نے علامہ اقبال کی مزار کمیٹی کے سیکرٹری خواجہ عبدالرحیم صاحب بیرسٹر سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کیا یہ سن پیدائش مزار کمیٹی نے حکومت افغانستان کو لکھ کر بھیجا تھا۔ اور اگر بھیجا تھا۔ تو کس بنا پر یا افغانستان والوں نے اپنی کسی اطلاع کے مطابق خود ہی یہ سن لکھوا دیا۔ افسوس ہے وہ اس کی وضاحت نہ فرما سکے کیونکہ زبانی انہیں کچھ یاد نہیں اور مزار کمیٹی کا ریکارڈ اس معاملہ میں قطعی خاموش ہے۔ چونکہ اس سن پیدائش کے صحیح ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں لہٰذا اسے خود علامہ کے بیان کردہ سن یعنی ۱۲۹۴ھ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کے رجسٹر پیدائش کا جائزہ لینے پر پایا گیا کہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کے اندراج کے بعد ۱۸۷۷ء تک علامہ کے والد صاحب کے ہاں کسی اور لڑکے کی پیدائش کا اندراج نہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ جب رجسٹر پیدائش میں ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کا اندراج نہیں تو یہ تاریخ پیدائش کیسے درست ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ رجسٹر پیدائش میں عدم اندراج عدم پیدائش کا ثبوت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس زمانہ میں رجسٹر پیدائش میں ہر ایک پیدائش درج کئے جانے کا اتنا اہتمام نہ تھا۔ جو ان دنوں میں ہے۔ لہٰذا امکان ہے کہ علامہ کی پیدائش درج نہ کرائی گئی ہو۔ بہر حال صرف عدم اندراج کی بنا پر علامہ کی اپنی بیان کردہ تاریخ پیدائش کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ مرے کالج سیالکوٹ کے رجسٹر میں جہاں حضرت علامہ کے داخلہ کالج کا اندراج ہے، وہاں

ان کی وفات کے بعد کالج کے پرنسپل اور وائس پرنسپل کا دستخطی ایک نوٹ درج ہے جسے حرف بحرف ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"He (Dr. Muhammad Iqbal) was born on 22nd February 1873 at Sialkot, a well known town on that border of the Punjab which adjoins Jammu."

This is the correct date as announced in the 'Daily Inqilab' Lahore, 7th May, 1938, on the authority of the brother of the deceased. In some other paper 1876 had been given as the year of his birth but the 'Inqilab' was asked to publish the dates found in the records of the family.

اس نوٹ سے واضح ہے کہ پرنسپل اور وائس پرنسپل نے "روزنامہ انقلاب" کے اس نوٹ پر انحصار کرتے ہوئے تاریخ پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء لکھی ہے جو انقلاب کی اشاعت ۷ مئی ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا اور جس کا ذکر پہلے کر دیا گیا ہے۔ پرنسپل کے نوٹ میں یہ بیان قطعاً درست نہیں کہ انقلاب نے یہ تاریخ پیدائش علامہ مرحوم کے بھائی کی تصدیق کے بعد شائع کی تھی۔ اس کے برعکس انقلاب کے نوٹ سے واضح ہوتا ہے کہ "انقلاب" نے حضرت علامہ کے بھائی کے بیان کردہ سن پیدائش کو رد کرتے ہوئے اپنی "تحقیق" کی بنا پر تاریخ پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء بیان کی ہے۔ پرنسپل کے نوٹ کا آخری فقرہ بھی درست نہیں اور نہ یہ فقرہ انقلاب کی اصل عبارت کے مطابق ہے۔ مزید برآں راقم الحروف نے حضرت علامہ کے برادرزادہ شیخ اعجاز احمد سے تصدیق کرا لی ہے۔ کہ ان کے ہاں کوئی ایسا "فیملی ریکارڈ" نہ اب ہے اور نہ پہلے کبھی تھا جس میں حضرت علامہ کی تاریخ پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء درج ہو۔

حضرت علامہ کی وفات کو ابھی صرف ۴۵ سال ہی گذرے ہیں کہ ان کی تاریخ پیدائش کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ چونکہ صحیح تاریخ کا تعین ضروری ہے۔ لہٰذا عزیزم جاوید اقبال اور شیخ اعجاز احمد نے مجھے مشورہ دیا کہ "روزگارِ فقیر" کے نقش ثانی میں اس موضوع کا جائزہ لے کر اس غلط فہمی کو رفع کر دینا چاہیئے۔ اور واضح حقائق کی بنا پر شائع کر دینا چاہیے کہ علامہ مرحوم کی اصل تاریخ پیدائش ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء بروز جمعہ ہے۔ اور انہوں نے ۶۱ سال کی عمر پائی۔ ایک روایت کے مطابق ۶۱، اور ۶۳ سال کے درمیان وفات پانا عاشقانِ رسول کا نشانِ امتیاز بھی رہا ہے۔

غلطیہائے مضامین مت پوچھ

گزشتہ پچیس تیس سال کی مدت میں ڈاکٹر صاحب کی شاعری، اُن کے فلسفے، تعلیمات اور زندگی پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے، اور ابھی بہت کچھ کہا اور لکھا جائے گا لیکن اُن کی سوانح حیات بقول فیض احمد فیض ـــــ "ان کی ذات کے اجنبی گوشوں اور اُن کی شخصیت کی غیر معروف گہرائیوں کی تحقیق کا کام ابھی تشنۂ تکمیل ہے" ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں واقعاتی معلومات فراہم کرنا۔ ان کے متعلق تنقیدی ادب کا ذخیرہ جمع کرنے سے کم نہیں اُن کے متعلق اکثر ایسی کتابیں اور مضامین شائع کئے جاتے ہیں جن سے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہے لیکن عام طور پر ایسے مضامین میں یا تو وہی باتیں دُہرائی جاتی ہیں، جو کئی بار پہلے

کہی جا چکی ہیں۔ یا پھر وہ افسانہ زدند والا معاملہ ہوتا ہے چاہیئے کہ مستند معلومات معتبر واقعات اور مصدقہ مواد فراہم کرنے کے لئے تحقیق و کاوش کی جائے۔ مگر ہوتا یہ ہے، کہ بعض لکھنے والے اپنے ذہن و دماغ سے اس کمی کو پورا کرتے ہیں اور نہ جانے وہ کس طرح مطمئن بھی ہو جاتے ہیں :

بارہ تیرہ سال ہوئے، ڈاکٹر صاحب کی برسی پر بعض مضامین کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے والد کی ایک تصویر بھی شائع کی گئی تھی، جس میں وہ اپنے دائیں بائیں دو چھوٹے بچوں کو لئے ہوئے بیٹھے ہیں۔ تصویر کے نیچے یہ عبارت درج تھی :۔

"اقبال اپنے والد بزرگوار کی گود میں"

(بائیں ہاتھ یعنی اپنے والد کی داہنی جانب اقبال ہیں اور داہنی طرف ان کے چچیرے بھائی) حالانکہ تصویر میں جو بچے ہیں۔ ان میں ایک تو ڈاکٹر صاحب کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد ہیں اور دوسرے ان کے بڑے صاحبزادے آفتاب اقبال۔ اقبال کے متعلق نئی چیز شائع کرنے کے شوق میں صاحب مضمون نے یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ یہ تصویر اقبال کی ہو بھی سکتی ہے یا نہیں؛

اقبال مرحوم پر حال ہی میں شائع ہونے والی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ علامہ کے آباو اجداد سری نگر میں رہتے تھے، حالانکہ خود ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق ان کے آباو اجداد کی سکونت موضع چکو پرگنہ آدون میں تھی، ایک عرصہ ہوا منشی محمد دین فوق نے چیدہ چیدہ کشمیری خاندانوں کا ایک تذکرہ "مشاہیر کشمیر" کے نام سے شائع کیا تھا، اس میں ڈاکٹر صاحب کے خاندان کی سکونت موضع "لوچر" یا "لوجر" بیان کی تھی، بعد ازاں

۱۹۲۰ء میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے نام ایک خط میں لکھا کہ اُن کی تحقیق کے مطابق ہمارے خاندان کی رہائش "لوچر" یا "لوجر" میں نہیں موضع چکو پرگنہ آدون میں تھی۔

کتاب مذکورہ بالا میں لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا ہنگامہ جب فرو ہو گیا، تو اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کے بزرگ کشمیر کے حکمرانوں کی سخت گیری کے باعث دوسرے بہت سے کشمیری خاندانوں کی طرح ہجرت کر کے سیالکوٹ پہنچے —— ترکِ وطن کی وجہ ممکن ہے یہی ہو، لیکن یہ درست نہیں ہے کہ اس خاندان نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے فرو ہونے پر کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں اقامت اختیار کی۔

اس واقعہ کی غلطی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے والد شیخ نور محمد سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے اور یہ پیدائش ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کی تھی؛ شیخ نور محمد کی پیدائش سے قبل اُن کے والدین کے یہاں دس لڑکے یکے بعد دیگرے پیدا ہو کر فوت ہو گئے۔

شیخ نور محمد اپنے گھر کے لوگوں سے ذکر کیا کرتے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے وقت میں گبرو جوان تھا ۱۸۵۹ء میں ان کے یہاں بڑے لڑکے شیخ عطا محمد پیدا ہوئے۔ شیخ نور محمد کا انتقال ۱۹۳۰ء میں ۱۷ اگست کو ہوا۔ شیخ عطا محمد نے جو یادداشت تحریر کی، اُس میں اپنے والد شیخ نور محمد جو ڈاکٹر اقبال کے بھی والد ہیں، کی عمر ۹۳ سال بتائی ہے، اس حساب سے اُن کا سنہ پیدائش ۱۸۳۷ء ہونا چاہیئے، اس تفصیل کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے، کہ ڈاکٹر صاحب کے آباو اجداد ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کشمیر کو خیرباد کہہ کر، سیالکوٹ میں اقامت گزیں

ہو چکے تھے۔

اسی کتاب میں شیخ نور محمد کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ پڑھے لکھے نہ تھے" اتنی بات تو بیشک درست ہے کہ شیخ نور محمد نے کسی مکتب یا اسکول میں باقاعدہ تعلیم نہیں پائی لیکن یہ بات قطعاً غلط ہے کہ وہ سرے سے پڑھنا لکھنا ہی نہیں جانتے تھے۔ ان کے اہل خاندان نے اس کی تصدیق کی ہے کہ شیخ نور محمد اپنے نامور صاحبزادے ڈاکٹر محمد اقبال کی اُردو فارسی کتابیں، جو اُن کی زندگی ہی میں شائع ہوگئی تھیں، قریب قریب روزانہ پڑھتے نظر آتے پڑھنے میں روانی کم ہوتی، رُک رُک کر پڑھتے، لیکن بعض مقامات پر اُن کی آواز میں کپکپی اور رقت پیدا ہوجاتی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے والد نہ صرف یہ کہ ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پڑھ سکتے تھے بلکہ اُن کے مفہوم و مطلب کو بھی سمجھتے تھے شیخ صاحب اپنے دستخط بڑے سادہ انداز میں کرتے تھے۔

کتاب مذکورہ میں یہ بھی ملتا ہے کہ شیخ نور محمد کے ہاں دو لڑکے پیدا ہوئے، اُن کے علاوہ تین لڑکیاں بھی تھیں، اتنی بات تو درست ہے کہ اُن کے ہاں صرف دو لڑکے زندہ رہے لیکن ڈاکٹر صاحب اور اُن کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے درمیان ایک اور لڑکا بھی پیدا ہوا، جو بالکل کمسنی میں فوت ہوگیا، علاوہ ازیں شیخ نور محمد کی اولاد میں جوان عمر تک جو لڑکیاں زندہ رہیں وہ چار تھیں نہ کہ تین؛

یہ کتاب بڑے ذمہ دار ادارہ کی جانب سے شائع ہوئی ہے اور اس میں ڈاکٹر صاحب کے والد کی وفات ۹۰ سال کی عمر میں ۱۹۲۹ء بیان کی گئی ہے، حالانکہ شیخ نور محمد کی وفات ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء کو ہوئی، اس وقت اُن کے بڑے لڑکے کی تحریر کردہ

یادداشت کے مطابق ان کی عمر ۹۳ سال کی تھی، ڈاکٹر صاحب کی والدہ کی تاریخ وفات ۹ نومبر ۱۹۱۴ء ہے یعنی شوہر سے سولہ سال قبل وہ اللہ کو پیاری ہوئیں۔

مزید کہا گیا ہے کہ شیخ عطا محمد فوج میں ملازمت کے کچھ عرصہ بعد، اُسے ترک کرکے رُڑکی انجینیرنگ سکول میں داخل ہوگئے، اصل واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے فوج کی ملازمت ترک نہیں کی تھی، بلکہ فوج والوں نے انہیں تامپسن انجینیرنگ اسکول رڑکی میں تعلیم پانے کے لئے سرکاری طور پر بھیجا تھا۔ وہاں سے کامیاب ہونے اور امتحان میں اوّل رہنے پر، اُنہیں فوج کے شعبہ "بارک ماسٹری" میں تعینات کیا گیا جہاں سے وہ فوجی عہدہ ہی سے ریٹائر ہوئے۔

یہ غلط بیانی بھی موجود ہے کہ شیخ عطا محمد کے دو صاحبزادے ہیں حالانکہ ان کے تین لڑکے تھے۔ منجھلے لڑکے نے شیخ عطا محمد کے انتقال کے چھ سال بعد وفات پائی۔

آگے چل کر تحقیق کی زحمت اُٹھائے بغیر لکھا گیا ہے کہ "مولنا ابراہیم میر سیالکوٹی کے بیان کے مطابق اقبال نے ۱۸۸۸ء میں پرائمری ۱۸۹۱ء میں مڈل اور ۱۸۹۳ء میں انٹرنس پاس کیا" ——————

حالانکہ پرائمری امتحان کے علاوہ باقی تمام دوسرے امتحانات پاس کرنے کی اصل سندات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مڈل ۱۸۹۱ء میں، انٹرنس ۱۸۹۳ء میں انٹرمیڈیٹ ۱۸۹۵ء میں بی، اے ۱۸۹۷ء میں اور ایم اے ۱۸۹۹ء میں پاس کیا تھا۔

اس کتاب میں یہ عبارت بھی نظر سے گزری کہ ڈاکٹر صاحب کی پہلی بیوی سے ایک لڑکی معراج بیگم (مرحومہ) اور ایک فرزند آفتاب اقبال پیدا ہوئے۔ لڑکی کا نام لکھنے میں

تذکرہ نگار سے چوک ہوگئی، اس کا نام مریم نہیں، معراج بیگم ہے۔

مصنف کتاب مذکور نے راوی کا حوالہ دیئے بغیر لکھا ہے کہ بچپن میں اقبال کو بٹیریں پالنے، کبوتر اڑانے اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کا بہت شوق تھا۔ اتنی بات تو بیشک درست ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو لڑکپن سے لے کر بڑے ہونے تک کبوتر پالنے کا شوق رہا لیکن مولوی میر حسن صاحب کے درس کی مجلس میں بٹیر بازی اور بے حد اطاعت گذار شاگرد کی گستاخانہ دیدہ دلیری کی کہانی جس نے بھی بیان کی ہے، سراسر زیادتی اور بے انصافی کی ہے۔

اس کتاب میں جو تصاویر شائع ہوئی ہیں، اُن میں سے بعض تصاویر سے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے۔

صفحہ ۹ کے مقابل "اقبال منزل" کے ایک کمرے کی تصویر ہے جس پر "کمرہ ولادت حضرت علامہ" مرقوم ہے، یہ کمرہ بازار کے رُخ پر سیالکوٹ کے مکان کی دوسری منزل میں ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب کی پیدائش کے وقت نہ یہ مکان موجودہ حالت میں تھا، اور نہ اس میں یہ کمرہ پایا جاتا تھا۔ "اقبال منزل" اس وقت یک منزلہ تھی اور مکانیت صرف دو کوٹھڑیاں ایک دالان، ڈیوڑھی اور صحن۔ ڈاکٹر صاحب کی پیدائش کے کئی سال بعد یکے بعد دیگرے دو ملحقہ مکان خرید کر شامل کئے گئے۔ اور اس طرح تین مکان مل کر ایک بڑا مکان ہو گیا۔ پھر غالباً ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں سارا مکان گرا کر، از سرِ نو عمارت بنائی گئی، جو اس وقت تک موجود ہے۔

اس مکان کی دوسری منزل کے ایک کمرے کو جو بازار کے رُخ پر ہے ڈاکٹر صاحب

کے "کمرۂ ولادت" کا نام دے دیا گیا ہے، جو حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس مکان میں پیدا ضرور ہوئے لیکن اس کمرے کی تخصیص ممکن نہیں چونکہ ڈاکٹر صاحب کی پیدائش کے وقت یہ کمرہ سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔

اسی طرح صفحہ ۱۰ کے مقابل ایک تصویر دکھائی گئی ہے جس پر "کمرہ مطالعہ حضرت علامہ" لکھا ہوا ملتا ہے۔ یہ نسبت بھی سراسر غلط اور مصوّر، راوی یا مُصنّف کے ذہن کی ایجاد کردہ ہے۔ کمرہ مذکور بازار کے رُخ پر واقع ہے، اور موجودہ مکان کی تعمیر کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۱۵ء میں مکان سے ملحقہ دوکان خرید کر، اسے از سرِ نو تعمیر کیا گیا۔ اس کے اوپر یہ کمرہ بنوا کر پہلے مکان سے ملا دیا گیا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب ڈاکٹر صاحب مستقل طور پر لاہور میں سکونت اختیار کر چکے تھے، اور عدالتوں کی تعطیلات میں سیالکوٹ آیا کرتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کمرے کو کبھی "کمرہ مطالعہ" کے طور پر استعمال نہیں فرمایا۔

اس طرح کی غلط روایات کا ریکارڈ میں آنا کسی طرح مناسب نہیں ایسی غلطیوں سے ایک تو کتاب کی علمی حیثیت مجروح ہوتی ہے، دوسرے پڑھنے والے غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

○

حیاتِ اقبال کی اہم یادداشتیں

اقبالیات پر بے شمار کتابوں کی اشاعت کے باوجود ڈاکٹر محمد اقبال سے متعلق مختلف تاریخی حوالوں کے حصول میں جو دشواری پیش آتی ہے اُسے ختم کرنے کے لئے ذیل میں ایک ایسا تاریخی خاکہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں مرحوم کی زندگی کی کم و بیش تمام اہم یادداشتیں یکجا کر دی گئی ہیں

واقعات	مقام	کیفیت
پیدائش	سیالکوٹ	جمعہ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء
مڈل پاس کیا	سیالکوٹ	۱۸۹۱ء
میٹرک پاس کیا	سیالکوٹ	۱۸۹۳ء
انٹرمیڈیٹ	سکاچ مشن کالج سیالکوٹ	۱۸۹۵ء
بی۔اے	گورنمنٹ کالج لاہور	۱۸۹۷ء
ایم۔اے	گورنمنٹ کالج لاہور	۱۸۹۹ء
عرصۂ قیام	بھاٹی دروازہ لاہور	۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۵ء
انگلستان	روانگی	۱۹۰۵ء
بار ایٹ لاء	لندن سے	۱۹۰۸ء
پی، ایچ، ڈی	میونک یونیورسٹی جرمنی سے	۱۹۰۷ء
وطن واپسی	لندن سے	۱۹۰۸ء

بیرسٹری شروع کی	لاہور میں	۲۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء
فلسفہ کے پروفیسر	گورنمنٹ کالج میں	۱۹۱۱ء
عرصۂ قیام	انار کلی	اکتوبر ۱۹۰۸ء تا ۱۹۲۲ء
عرصۂ قیام	میکلوڈ روڈ	۱۹۲۲ء تا ۱۹۳۵ء
خطاب	"سر" حاصل ہوا	جنوری ۱۹۲۳ء
پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے الیکشن میں حصہ اور کامیابی		دسمبر ۱۹۲۶ء
عرصۂ رکنیت	جاری رہا	۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۹ء
اسلامیات پر لیکچرز	مدراس میں	۱۹۲۹ء
سفر حیدر آباد	(دکن)	۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء
تصورِ پاکستان پیش کیا	آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الہ آباد	۱۹۳۰ء
دوسری گول میز کانفرنس	لندن میں شرکت	۷ ستمبر ۱۹۳۱ء تا یکم دسمبر ۱۹۳۱ء
تیسری گول میز کانفرنس		۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء تا ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء
سفر روم	مسولینی سے ملاقات	۱۹۳۳ء
سفر سپین	مسجد قرطبہ میں ادائیگی نماز	۱۹۳۳ء
سفر افغانستان	حکومتِ افغانستان کی دعوت پر	اکتوبر ۱۹۳۳ء
سفر بھوپال	سر راس مسعود کے ہاں قیام	۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۷ء
عرصۂ قیام	جاوید منزل میو روڈ لاہور	۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۸ء
وفات	لاہور	۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء



جاوید منزل کا وہ کمرہ خاص جہاں شاعرِ مشرق کے دستِ عقیدت مندوں اور نئے ملاقاتیوں کی آمد ہر وقت جاری رہتی، فلسفہ، حکمت، سیاست اور عشق و خرد کی کونسی گتھیاں ہیں جو یہاں سلجھائی نہیں گئیں، محفلِ اقبال کی یہ ہنگامہ آرائیاں اور بے تکلف احباب کے قہقہے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو اسی یادگار فضا میں آنسوؤں کی تحلیل ہوگئے۔

بانگِ رحیل

ڈاکٹر صاحب مدت سے دردِ گردہ اور نقرس میں مبتلا تھے۔ ۱۹۳۴ء میں عید کی نماز پڑھ کے آئے، گرم گرم سویاں کھالیں، فوراً گلا بیٹھ گیا۔ کئی طبیبوں اور ڈاکٹروں کا علاج کرایا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ہر مرتبہ نئی تشخیص، نیا علاج، نئی دوائیں، پھر بڑا سخت قسم کا پرہیز، کبھی کبھی تھوڑا بہت افاقہ ہو جاتا، لیکن مرض دور ہونے میں نہیں آتا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں جاوید کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی صحت پر اس سانحہ کا بڑا ناگوار اثر پڑا، اور کئی دوسرے عوارض پیدا ہو گئے، اور عوارض تو ایسے خطرناک نہیں تھے لیکن ایک بڑی پیچیدگی پیدا ہو گئی کہ ان کا قلب پھیلنا شروع ہو گیا۔ ان کے معالج اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا بچنا محال ہے اور خود وہ بھی اپنی صحت کی جانب سے مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن وہ نہ تو مضطرب تھے اور نہ موت سے خائف اس زمانے میں بھی ان کے ہاں بڑے بڑے دقیق مسائل پر اظہارِ خیال کیا جاتا۔ اٹلی اور ایبے سینیا کی کشمکش، ہندوستان کے مسائل لیگ اور کانگرس، مسلمانوں کے حقوق اور ان کے تحفظ کے ذرائع و وسائل پر لمبی لمبی بحثیں اور گفتگوئیں ہوتی تھیں، تکلیف کے پیشِ نظر ڈاکٹروں اور طبیبوں کی رائے یہ تھی کہ انہیں زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں، میں جب ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ زیادہ تر خاموش بیٹھا رہتا تھا، کوئی ایسی بات نہیں کرتا تھا، جو انہیں لمبی بحث چھیڑنے پر آمادہ کرے لیکن جب وہ کسی مسئلہ پر اظہارِ خیال شروع کر دیتے، تو انہیں روکنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی

اُس زمانے میں ایک دن سیالکوٹ کے رہنے والے ایک دوست نانک چند کے ہمراہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نانک چند مولوی سید میر حسن کی محفلوں میں اکثر شریک ہوتے رہتے تھے، ان سے مل کر ڈاکٹر صاحب کو پرانا زمانہ یاد آگیا۔ ان دنوں ان کی حالت بہتر تھی، اس لئے قدرے سکون سے گفتگو کرتے رہے۔

لیکن اس واقعہ کے چند ہفتے بعد یعنی ۲۱، اپریل ۱۹۳۸ء کو صبح ۵ بجے شہر بھر میں یہ خبر پھیل گئی۔ کہ حکیم الامت اپنے مولا سے جا ملے میں نے یہ خبر سنی تو بے اختیار آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔ فوراً جاوید منزل کا رُخ کیا۔ ڈاکٹر صاحب کا وفادار بوڑھا ملازم علی بخش کوٹھی کے باہر چیخیں مار مار کے رو رہا تھا۔ مرحوم جس کمرے میں اکثر سویا کرتے تھے اسی کمرے میں اسی پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے، اور سکوتِ ابدی نے انہیں اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ ان کے قریب چند احباب کے ساتھ چودھری محمد حسین اور مسٹر محمد شفیع جو ممتاز صحافی ہیں کھڑے تھے، سب کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے، اور شدتِ گریہ سے ہچکی بندھی ہوئی تھی، میں کچھ دیر تک چپ چاپ اُن کے چہرے کو تکتا رہا۔ چہرہ اضمحلال اور پژمردگی کے آثار سے پاک تھا۔ پیشانی پر طمانیت کے زاویے اُبھرے ہوئے تھے، اور ہونٹوں پر مسکراہٹ اس طرح کھیل رہی تھی، گویا حکیم الامت زیرِ لب گنگنا رہے ہیں ؎

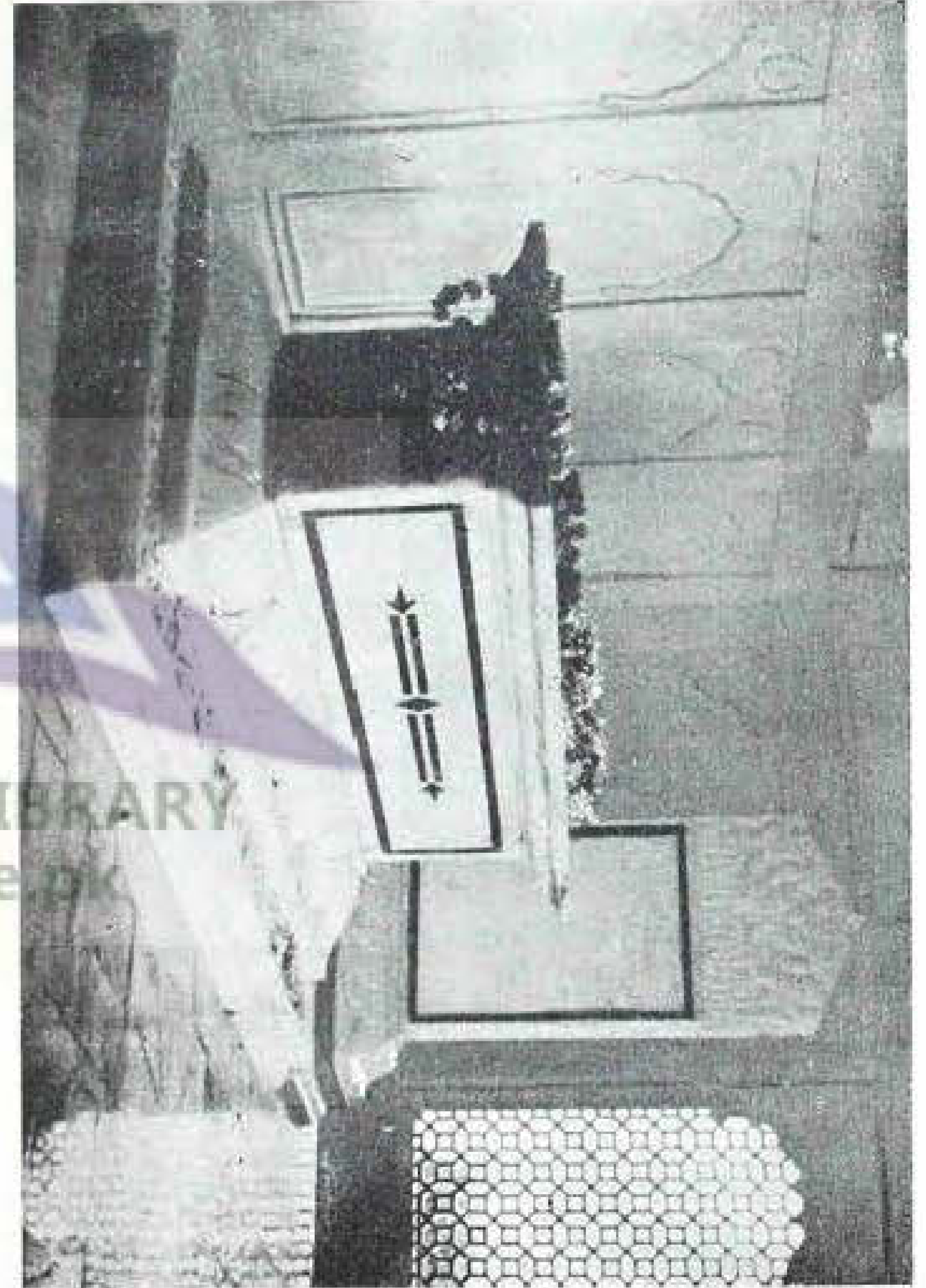
سحرہا در گریبانِ شبِ دوست   دو گیتی را فروغ از کوکبِ اوست
نشانِ مردِ مومن با تو گویم   چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست

میں کچھ دیر یونہی چپ چاپ استغراق کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر یکبارگی چونک پڑا۔ اور بے تابانہ مرحوم کے کمرے سے نکل آیا۔ ڈاکٹر صاحب کے جگری دوست چودھری

محمد حسین تجہیز و تکفین دوسرے لوگوں کے سپرد کر کے مرحوم کی ابدی خوابگاہ کے لئے مناسب جگہ کی تلاش میں مصروف ہو گئے، سب کا یہی خیال تھا۔ کہ ان کے مزار کے لئے کوئی ایسی جگہ منتخب کی جائے، جو ان کے شایانِ شان ہو، چودھری صاحب کی رائے تھی۔ کہ علامہ کو مسجد عالمگیری کے سامنے دفن کیا جائے۔ اس کے لئے محکمہ آثار قدیمہ کے اعلیٰ افسروں کی اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ ان سے رابطہ قائم کر کے یہ اجازت حاصل کر لی گئی، ہجوم لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جاتا تھا۔ ہر شخص حکیم الامت کا دیدار کرنا چاہتا تھا۔ خواب گاہ کے قریب غسل خانہ تھا۔ اس کا دروازہ کھلوا دیا گیا۔ تاکہ لوگ آخری مرتبہ اُن کا دیدار کر لیں۔

میں سہ پہر کو جب دوبارہ جاوید منزل پہنچا۔ تو تکفین کے بعد مرحوم کا جنازہ کوٹھی کے باہر لایا جا رہا تھا، میں نے سوچا کہ تین میل لمبے راستے میں جنازے کو کاندھا دینے کی حسرت خاطر خواہ پوری ہوگی۔ مگر میرا یہ خیال بالکل غلط نکلا، دیکھتے ہی دیکھتے لاہور اور بیرونِ شہر کے مسلمانوں کا ایک ایسا سیلاب اُمڈ آیا۔ کہ میلوں تک انسانوں کے سر ہی سر دکھائی دیتے تھے جیسے لاہور کے راستوں میں آج انسانوں کے جسم اُگ آئے ہیں، غازی علم الدین اور ڈاکٹر اقبال دو ہی ایسے خوش نصیب انسان گزرے ہیں، جن کے لئے پورا لاہور شہر حرکت میں آگیا! اتنا بڑا تعزیتی اجتماع پھر دیکھنے میں نہیں آیا میری نگاہوں میں وہ سماں اب تک گھوم رہا ہے

سردار سندر سنگھ مجیٹھیا کار میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی قیام گاہ پہنچے، اور جنازے پر پھولوں کا بڑا سا ہار ڈالتے ڈالتے ان کا چہرہ رنج و ملال کی تصویر بن گیا۔ درحقیقت اپنے بے پناہ اخلاص کے سبب ڈاکٹر صاحب غیر مسلموں میں بھی اتنے ہی مقبول تھے، جتنے مسلمانوں میں۔



شاعرِ مشرق کی آخری آرام گاہ، جہاں ملت خوابیدہ کو بیدار کرنے والا خود محوِ خواب ہے

جنازہ ۵ بجے شام میو روڈ سے جو اب علامہ اقبال روڈ کے نام سے مشہور ہے روانہ ہوا تو اژدہام کی کیفیت تھی، کہ جنازہ کو کاندھا دینا تو ایک طرف، اُس کے قریب پہنچنا بھی ناممکن نظر آنے لگا۔ جنازہ جب اسلامیہ کالج کے سامنے سے گزرا تو وہاں بڑا ہی سادہ لیکن رقت انگیز منظر دیکھنے میں آیا، چھوٹے چھوٹے یتیم بچے ہاتھوں میں اپنی تیار کردہ سیاہ کاغذ اور کانوں کی جھنڈیاں اٹھائے قطار در قطار نظم و ضبط کے ساتھ کھڑے تھے۔ جنازہ گذرا تو انہوں نے جھنڈیاں سرنگوں کر دیں معصوم بچوں کے بھولے بھالے چہروں پر غم و ملال کی دُھندلی دھندلی پرچھائیاں، اظہارِ غم کا یہ منظر اس قدر سادہ لیکن پُر اثر تھا۔ کہ میں بے اختیار رو پڑا۔ اور اب بھی تصور کرتا ہوں۔ تو یہ دلدوز سماں از خود رفتہ کر دیتا ہے

جو بے مثال ماتمی جلوس حکیم الاُمت کے جسدِ خاکی کو آخری آرام گاہ تک لے جا رہا تھا۔ اُس میں سوگوار عوام کی بھاری تعداد ہی شامل نہ تھی، شہر اور صوبہ پنجاب کی برگزیدہ ہندو، مسلمان اور عیسائی شخصیتیں بھی شریکِ غم تھیں۔ گورنر پنجاب اور ہز ہائی نس بہاولپور کے پرائیویٹ سیکریٹری، ہائی کورٹ کے جج، وزراء، اعلیٰ حکام اور عمائدینِ قوم سوگوار عوام کے آگے آگے چل رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سارا چمن اداس ویران اور خزاں رسیدہ ہے۔ شاہی مسجد کے اندر پہنچ کے نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ اور جسدِ خاکی سپردِ خاک کیا گیا۔

اس حادثہ کو پچیس برس گذر چکے ہیں، لیکن کبھی کبھی یہ واقعات اس طرح ایک ایک کر کے نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں، گویا یہ سب کچھ ابھی ابھی گزرا ہے، ڈاکٹر صاحب کی نعش سپید کفن میں لپٹی ہوئی ہے، ان کے عقیدت مند اور احباب جمع ہیں۔ دبی دبی سسکیوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ پھر میں دیکھتا ہوں۔ جنازہ اٹھا ہے، گریہ و زاری

کا شور برپا ہے جنازہ شہر کے گلی کوچوں میں سے گزرا چلا جا رہا ہے۔ لوگوں کے سر جھکے ہیں۔ چہرے اُداس آنکھوں کے گرد حلقے۔ ہر شخص یہ محسوس کر رہا ہے گویا اقبال کی موت اس کا ذاتی نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ پھر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہم ان کے مزار کے کنارے کھڑے ہیں؛ قبر کو مٹی دی جا رہی ہے؛ میرا سر جھک جاتا ہے، اور زبان سے بے اختیار یہ شعر نکل جاتا ہے ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مزار کی تعمیر

۱۹۳۸ء میں "جاوید منزل" میں ایک اجتماع ہوا، جس میں علامہ مرحوم کے مزار کی تعمیر کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔ چوہدری محمد حسین اس کمیٹی کے صدر اور شفاء الملک حکیم قرشی، میاں امیرالدین، راجہ حسن اختر، حمید نظامی مرحوم اور شیخ محبوب الٰہی وغیرہ ارکان منتخب ہوئے۔ خواجہ عبدالرحیم کمیٹی کے سیکریٹری مقرر کئے گئے جو اب تک یہ فرائض انجام دے رہے ہیں۔ بعد میں راجہ حسن اختر "مزار کمیٹی" کے صدر چُنے گئے، اور کچھ نئے ممبر بھی شامل کئے گئے۔

مزار کی تعمیر کا کام کئی سال تک معرض التوا میں رہا۔ آٹھ سال کے بعد ۱۹۴۶ء عیسوی میں اس کام کا آغاز ہوا اور سات آٹھ سال میں اختتام کو پہنچا۔ مزارِ اقبال کی تعمیر میں ایک لاکھ روپیہ کے قریب صرف ہوئے۔ کمیٹی نے حیدر آباد دکن کے ممتاز ماہرِ فنِ تعمیر نواب زین یار جنگ سے رابطہ قائم کیا۔

انہوں نے حیدر آباد سے مزار کا نقشہ بنا کر بھیجا جسے کمیٹی نے پسند نہیں کیا، پھر انہیں لاہور آنے کی دعوت دی گئی، جب وہ لاہور آئے تو مزار کمیٹی کے چیئرمین چوہدری محمد حسین اور دوسرے ارکان انہیں علامہ مرحوم کی آخری آرام گاہ پر لے گئے تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے مزار کے محلِ وقوع اور اس کے گرد و پیش کے مناظر اور عمارتوں کو دیکھ لیں۔

چوہدری محمد حسین نے نواب زین یار جنگ سے کہا "حکیم الامت کے مزار کے ایک جانب شاہی مسجد ہے جو مسلمانوں کی روحانی عظمت کو نمایاں کر رہی ہے دوسری طرف مغلیہ دورِ حکومت کا قلعہ ہے جو مسلمانوں کی دنیاوی سطوت و طاقت کا نشان ہے، اس سارے ماحول اور آثار و نشانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مقبرہ کا نقشہ اس انداز کا ہونا چاہئے کہ دیکھنے والا ایک نظر میں یہ محسوس کر سکے کہ یہ مشرق کے عظیم فلسفی شاعر اور ملت اسلامیہ میں شعور و احساس کی روح بیدار کرنے والے مجدد قوم کی خواب گاہ ہے"۔ نواب زین یار جنگ نے کمیٹی کے منشاء اور نقطۂ نگاہ کو اچھی طرح سمجھ لیا، چنانچہ انہوں نے بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ نقشہ تیار کیا، جسے کمیٹی نے پسند اور منظور کر لیا، علامہ مرحوم کا مزار اسی نقشہ کے مطابق تعمیر ہوا۔

مزارِ اقبال کے اندرونی حصہ خصوصاً تعویذ اور لوحِ مزار کے بارے میں ایک واقعہ کا اظہار نہ کیا جائے تو یہ داستانِ عقیدت و محبت نامکمل رہ جائے گی۔ سردار صلاح الدین سلجوقی جو ہندوستان میں حکومتِ افغانستان کے سفیر تھے، علامہ کے بہت بڑے مداح اور قدر شناس تھے، اور ان کی زندگی ہی میں ڈاکٹر صاحب سے اُن کے ذاتی روابط قائم ہو چکے تھے، چنانچہ ڈاکٹر صاحب جب تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں انگلستان کے بحری سفر



لاہور کی عظیم الشان بادشاہی مسجد کے زیر سایۂ مزار حکیم الامت
گو کہم با دیدۂ بیدار بخش   مرقدے در سایۂ دیوار بخش (اقبال)

کے لئے بمبئی پہنچے، تو انہوں نے سردار صلاح الدین سلجوقی کے یہاں قیام فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد سردار صاحب نے اپنے ممدوح کے مزار کی تعمیر کے سلسلہ میں اپنی حکومت سے رابطہ پیدا کیا۔ اور ان کی اس دلچسپی کا یہ نتیجہ نکلا کہ حکومتِ افغانستان نے تعویذ اور لوحِ مزار کی پیشکش اپنی طرف سے کی۔

افغانستان میں یہ تعویذ اور کتبہ دُنیا کے سب سے زیادہ قیمتی پتھر LAPIS LAZULI سے تیار کیا گیا یہ پتھر افغانستان اور وسط ایشیا کے علاوہ دنیا میں اور کہیں دستیاب نہیں ہو سکتا، افغانستان سے تعویذ اور کتبہ کے ان مجری اجزاء کو علیحدہ علیحدہ ضروری ہدایات کے ساتھ نہایت محفوظ کر کے لاہور بھیجا گیا۔

قدموں کی جانب دو مشعلیں بھی تھیں، جو راستے میں افسوس ہے کہ ٹوٹ گئیں اور یہاں دوبارہ نہیں بن سکیں، یہ جگہ اب تک خالی ہے، یہ مشعلیں بھی LAPIS LAZULI پتھر کی بنی ہوئی تھیں۔ لوحِ مزار کے پتھر کی نمایاں خوبی یہ ہے وہ اس قدر شفاف TRANSPARENT ہے کہ ایک طرف کی روشنی، دوسری جانب صاف نظر آسکتی ہے، اس زمانے میں اس پتھر کی قیمت ایک لاکھ روپے تھی، جو آج کل کے چھ سات لاکھ روپے سے کسی طرح کم نہیں کتبہ پر جو عبارت پیش منظر اور پس منظر کندہ ہے، وہ درج ذیل ہے۔

اِنَّ مِنَ الشِّعرِ الحِکمۃً   وَاِنَّ مِنَ البَیانِ سِحرا

پیش منظر

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم   چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو برما حرام است   کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

کے لئے بمبئی پہنچے، تو انہوں نے سردار صلاح الدین سلجوقی کے یہاں قیام فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب
کے انتقال کے بعد سردار صاحب نے اپنے ممدوح کے مزار کی تعمیر کے سلسلہ میں اپنی حکومت سے
رابطہ پیدا کیا۔ اور ان کی اس دلچسپی کا یہ نتیجہ نکلا کہ حکومتِ افغانستان نے تعویذ اور لوحِ مزار
کی پیشکش اپنی طرف سے کی۔

افغانستان میں یہ تعویذ اور کتبہ دُنیا کے سب سے زیادہ قیمتی پتھر
LAPIS LAZULI سے تیار کیا گیا یہ پتھر افغانستان اور وسط ایشیا کے علاوہ
دنیا میں اور کہیں دستیاب نہیں ہو سکتا، افغانستان سے تعویذ اور کتبہ کے ان حجری اجزا
کو علیحدہ علیحدہ ضروری ہدایات کے ساتھ نہایت محفوظ کر کے لاہور بھیجا گیا۔

قدموں کی جانب دو شمعلیں تھیں، جو راستے میں افسوس ہے کہ ٹوٹ گئیں اور
یہاں دوبارہ نہیں بن سکیں، یہ جگہ اب تک خالی ہے، یہ شمعلیں بھی LAPIS LAZULI
پتھر کی بنی ہوئی تھیں، لوحِ مزار کے پتھر کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ اس قدر شفاف
TRANSPARENT ہے کہ ایک طرف کی روشنی، دوسری جانب صاف نظر آتی
ہے، اُس زمانے میں اس پتھر کی قیمت ایک لاکھ روپے تھی، جو آج کل کے چھ سات لاکھ
روپے سے کسی طرح کم نہیں کتبہ پر جو عبارت پیش منظر اور پس منظر کندہ ہے، وہ درج ذیل ہے۔

اِنَّ مِنَ الشِّعرِ لَحِکمَۃً   وَاِنَّ مِنَ البَیانِ لَسِحرا

پیش منظر

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم   چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بُو بر ما حرام است   کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

پس منظر

"شاعر و فیلسوفِ مشرق ڈاکٹر محمد اقبال کہ راہِ سعی و عمل و رُوحِ اسلام را بہم
کناں روشن ساختہ و ازیں رو مظہرِ قبولِ اعلیحضرت محمد نادر شاہ غازی و ملت
افغان واقع شدہ ۱۲۹۲ھ تولد و بتاریخ ۱۳۵۷ھ وفات یافت"

مزار کی چھت کے لئے جو اشعار منتخب کئے گئے، وہ ایک مخصوص کمیٹی کی سعیِ فکر و تلاش
کا نتیجہ تھے، یہ کمیٹی چوہدری محمد حسین، راجہ حسن اختر اور خواجہ عبدالرحیم پر مشتمل تھی، مشہور
خطاط ابنِ پروین رقم نے ان اشعار کو اس قدر حسن و زیبائی کے ساتھ رقم کیا، کہ
فنِ کتابت کا ایک شاہکار پتھر کے قالب میں ڈھل گیا۔ ۱۹۵۰ء میں جب رضا شاہ پہلوی
شہنشاہ ایران مزارِ اقبال پر فاتحہ خوانی کے لئے آئے تو اِن اشعار کو دیکھ کر بیساختہ اُن
کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا۔   "خوشخطی خوب است"

چھت پر جو اشعار مرقوم ہیں۔ وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

دمم مرا صفتِ بادِ فرودیں کردند   گیاہ را ز سرشکم چو یاسمیں کردند
نمودِ لالۂ صحرا نشیں ز خونابم   چنانکہ بادۂ لعلے بساتگیں کردند
بلند بال چنانم کہ بر سپہرِ بریں   ہزار بار مرا نوریاں کمیں کردند
فروغِ آدمِ خاکی ز تازہ کاری ہاست   مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند
چراغِ خویش برافروختم کہ دستِ کلیم   دریں زمانہ نہاں زیرِ آستیں کردند
در آ بسجدہ و یاری ز خسرواں مطلب   کہ روزِ فقر نیاگانِ ما چنیں کردند

(محمد صدیق الماس رقم)